اکبر الٰہ آبادی مرحوم پر بہت لکھا جا چکا ہے، اس نئی کتاب میں مؤلف نے جدت سے کام لیا ہے، اور اکبر مرحوم کے خطوط سے ان کے حالات، مذہب، ادب، تعلیم، سیاست اور دوسرے مسائل کے متعلق ان کے خیالات اس میں جمع کیے ہیں، اپنی طرف سے کوئی اضافہ نہیں کیا ہے، اس طرح اس کی حیثیت اکبر کی کہانی خود ان کی زبانی یا ان کے خود نوشت روزنامچہ کی سی ہے، جو ان کے سوانح و افکار اور شاعری اور اس عہد کے واقعات کے متعلق ایک مستند دستاویز ہونے کے علاوہ ان کے شگفتہ اور ظریفانہ طرزِ نگارش کا دلچسپ نمونہ بھی ہے، خواجہ حسن نظامی مرحوم کی کتاب "غالب کا روزنامچہ غدر کے بعد" اس طرز کی یہ دوسری کتاب ہے، شروع میں ملا واحدی کے شگفتہ قلم نے تعارف اور مرتب نے مبسوط پیش لفظ لکھا ہے،

نوائے شوق: مرتبہ پروفیسر واحد ادیب صاحب ایم اے، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت نفیس، صفحات ۱۴۴، قیمت درج نہیں، پتہ: پروفیسر واحد ادیب، دانشمنداں، امروہہ یو پی۔

یوسف علی خاں صاحب یوسف ریاست رامپور کے ایک کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر ہیں، وہ اردو کی مختلف اصناف سخن کے علاوہ فارسی میں بھی دادِ سخن دیتے ہیں، لیکن غزل سے خاص ان کو مناسبت ہے، نوائے شوق ان کی غزلیات کا مجموعہ ہے، اس میں چار فارسی غزلیں بھی ہیں، یوسف صاحب کا تغزل ظاہری و باطنی خوبیوں سے آراستہ ہے، شروع میں واحد ادیب صاحب کے قلم سے طویل مقدمہ ہے جو شاعر کے حالات، شاعری پر تبصرہ اور مجموعہ کی اشاعت کی روداد وغیرہ پر مشتمل ہے، تبصرہ میں ایک حد تک مبالغہ سے کام لیا گیا ہے،

"ض"

جلد ۹۹ ماہ ذیقعدہ ۱۳۸۶ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۶۷ء عدد ۳

مضامین

شذرات

افسوس ہے کہ آصف جاہی خاندان کے آخری فرمانروا نظام الملک آصفجاہ نواب میر عثمان علی خاں نے ۲۴ فروری کو جان جان آفریں کے سپرد کر دی، وہ محض ایک والی ملک نہیں بلکہ اپنے اوصاف اور کارناموں کے لحاظ سے پوری تاریخ اور ایک عہد تھے، آصفجاہی حکومت اپنی تہذیب و روایات اور آئین و آداب میں تیموری حکومت کی جانشین تھی، اور میر عثمان علی خاں اس کی آخری یادگار تھے، انھوں نے اپنے دور میں جو گوناگوں کارنامے انجام دیے اس کی مثال ہندوستان کے کسی والی ریاست میں نہیں مل سکتی، ہندوستان کا کوئی قومی و ملی ادارہ انکی فیاضی سے محروم نہ تھا اور ان کا ابر کرم بلا تفریق مذہب و ملت سب پر یکساں برستا تھا، انکی ذات سے سیکڑوں حاجتمند خاندانوں اور ہزاروں غربا پرورش پاتے تھے، انکی علم نوازی نے ہندوستان کے ہر فن کے اہل کمال کو حیدرآباد میں جمع کر کے بغداد و قرطبہ کی یاد تازہ کر دی تھی، انکا سب سے بڑا کارنامہ عثمانیہ یونیورسٹی ہے جس میں جملہ جدید علوم کی تعلیم اردو زبان میں ہوتی تھی اور اسکے تعلیم یافتہ استعداد و قابلیت میں ہندوستان کی کسی یونیورسٹی کے طلبہ سے کم نہ تھے، یہ یونیورسٹی پورے ایشیا کے لیے قابل فخر تھی، مگر افسوس اندھے تعصب نے اسکو ختم کر دیا اور اسکا بیش قیمت علمی ذخیرہ ردی بن کر رہ گیا جو پوری علمی دنیا کا ماتم ہے۔

دولت کے لحاظ سے میر عثمان علی خاں دنیا کے امیر ترین آدمیوں میں تھے، حکومتوں اور بڑے بڑے بینکوں کو چھوڑ کر نقد سونے کی شکل میں اتنی دولت شاید ہی کسی فرد واحد کے پاس نکل سکے، اس ثروت کے ساتھ انکی زندگی اتنی سادہ تھی کہ اس کا قیاس کرنا مشکل ہے، ان سے بعض غلطیاں بھی ہوئیں جو ان کے غلط اندیش مشیروں کا نتیجہ تھیں جس سے ریاست حیدرآباد اور یہاں کے مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا اور خود نظام کی زندگی کا آخری زمانہ بڑی بیچارگی میں گذرا، ورنہ ریاست حیدرآباد کا اس افسوسناک

شکل میں خاتمہ نہ ہوتا، مگر غلطیوں سے کون انسان خالی ہے، اللہ تعالیٰ ان کو معاف اور انکے اعمال خیر کے صلہ میں انکی مغفرت فرمائے، ان کی موت سے ایک عہد کا خاتمہ ہو گیا۔ والبقاء للہ وحدہٗ

الیکشن کے جو نتائج نکلے وہ کوئی غیر متوقع نہیں ہیں، کانگریس تنزل و انتشار کی جس منزل پر پہنچ چکی تھی، اس کا لازمی نتیجہ یہی نکلنا چاہیئے تھا، اس کو ۱۹ سال سے زیادہ حکومت کا موقع ملا اور اس میں شک نہیں کہ اس مدت میں بعض حیثیتوں سے اس نے ملک کو بہت آگے بڑھایا، تین بڑے بڑے منصوبے پورے کیے، بین الاقوامی دنیا میں ہندوستان کی ساکھ قائم کی، لیکن سب سے بڑی بنیادی ضرورت بھوکے ہندوستان کا پیٹ نہ بھر سکی اور زندگی کی مشکلات ناقابل برداشت حد تک پہنچ گئیں، اس نے اپنے اعلیٰ اصولوں کو بالکل فراموش کر دیا، اور اخلاقی حیثیت سے بہت گر گئی، حکومت کے نشہ نے حکمراں طبقہ میں وہ ساری خرابیاں پیدا کر دیں جو اقتدار کی ہوس اور طاقت کا گھمنڈ پیدا کر سکتے ہیں، اس نے حکومت کو اپنی میراث سمجھ لیا، خدمت اور ایثار و خلوص کے بجائے حکومت و اقتدار اسکا اصل مقصد بن گئے، اس کے لیے خود کانگریسیوں میں جنگ اور گروہ بندی شروع ہو گئی، حکومت میں طرح طرح کی بدعنوانیاں پیدا ہو گئیں اور اس کا نظام اتنا بگڑ گیا اور زندگی کی مشکلات اتنی بڑھ گئیں کہ لوگ حسرت کے ساتھ انگریزوں کا زمانہ یاد کرنے لگے، اس نے کانگریس کا وقار بالکل ختم کر دیا اور اس سے ایک عام بیزاری پھیل گئی، کانگریس کے صاحب ضمیر طبقہ تک کو اس کا اعتراف ہے، خود صدر جمہوریہ نے ان حالات کی طرف اشارہ کیا ہے، کانگریس کے وہ نقیب اخبارات جو ہمیشہ کانگریس کا گن گایا کرتے تھے، اسکی غلطیوں کی بھی تاویلیں کرتے تھے، اسکی حمایت کو مذہبی فریضہ بتاتے تھے جنھوں نے اسکی حمایت اور دوسری پارٹیوں کی مخالفت میں پورا زور صرف کر دیا تھا، اب ایک ایک کر کے اسکی وہی غلطیاں گنا رہے ہیں، جو کانگریس کے مخالفین برسوں سے گناتے چلے آ رہے تھے۔

ان خرابیوں کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ کانگریس کی پرانی نسل کے اٹھنے کے بعد جو اسکے مشن کی اصلی حامل تھی اور جس نے ملک کی آزادی کے لیے قربانیاں کی تھیں جن لوگوں نے انکی جگہ لی، وہ ایثار

قربانی اور خلوص کے نام سے ناواقف تھے، ان کے پیش نظر صرف حکومت اور اس کے فوائد تھے، بعض پرانے خام کانگریسی بھی اسی رنگ میں رنگ گئے، جو دو چار مخلص باقی رہ گئے تھے، انھوں نے یہ رنگ دیکھکر یا خاموشی اختیار کرلی یا گوشہ نشین ہو گئے، اور کانگریس پر ان لوگوں کا غلبہ ہو گیا جو اس کی روح سے ناآشنا تھے، جب تک پنڈت جواہر لال نہرو زندہ رہے اپنی شخصیت سے ان کو دبائے رکھا، ان کے بعد یہ بند ٹوٹ گیا اور اس پر نئی طاقتیں غالب آگئیں، جن کو کانگریس کے اصولوں اور نظریات سے کوئی تعلق نہ تھا،

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے کانگریس نے انھیں بالکل نظر انداز کر دیا، انکی ایک تمنا بھی پوری نہیں کی بلکہ ان کو ان کے جائز حقوق سے بھی محروم کر دیا، ان کی زبان اور انکی تہذیب کو مٹانے کی کوشش کی، فرقہ پرور جماعتوں کو ان کے مقابلہ میں بالکل آزاد چھوڑ دیا، ایسی جماعت سے مسلمانوں کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے، یوں تو ان کے بہت سے مسائل ہیں لیکن ان میں سے تین سب سے مقدم ہیں، اردو زبان، سیکولر تعلیم اور مسلم یونیورسٹی، اردو زبان اور سیکولر تعلیم پر ان کے مذہب و تہذیب کا دارومدار ہے، اردو ان کی تہذیبی و علمی زبان ہے، اس میں ان کے مذہب کا بڑا ذخیرہ ہے، سیکولر تعلیم سے کم سے کم ان پر کسی دوسری تہذیب و مذہب کا نقش قائم نہ ہونے پائیگا، مسلم یونیورسٹی ان کی تہذیبی روایات کا مرکز اور ان کے دل و دماغ کا سرچشمہ ہے، جب تک ان کے حسب منشا یہ مسائل حل نہ ہوں گے وہ مطمئن نہیں ہو سکتے، اس میں شبہ نہیں کہ اس لحاظ سے کانگریس اب بھی دوسری پارٹیوں کے مقابلہ میں غنیمت ہے، کم سے کم اس کے اصول و نظریات اعلیٰ ہیں، اس کے سامنے ایک تعمیری پروگرام ہے، اس کو ۹۰ سال کا برا بھلا تجربہ ہے، جو کسی دوسری پارٹی کو حاصل نہیں ہے، اس لیے اگر اب بھی وہ اپنی خامیوں اور غلطیوں کا جائزہ لے کر ان کی اصلاح کرے تو اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر سکتی ہے، ورنہ اس کا خاتمہ یقینی ہے۔

مقالات

ذالک الفوز العظیم

سفرنامۂ حج مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم

(۲)

مدینہ طیبہ کا مبارک سفر

۳ محرم الحرام کو صبح کے وقت بعد نماز فجر بے فکر کے یہ مصرع موزوں ہو گیا

ع خوشا نصیب کہ حسرت چلا مدینے کو

تھوڑے سے خیال میں دوسرا مصرع بھی موزوں ہو کر شعر پورا ہو گیا

ع نوید آنکھ کو ہو، تہنیت ہو سینے کو

روانگی تک اکثر ایک ذوق کے ساتھ یہ شعر ورد زبان رہا ہے

خوشا نصیب کہ حسرت چلا مدینے کو ۔۔۔ نوید آنکھ کو ہو، تہنیت ہو سینے کو

جیسا کہ بیان ہوا روانگی ۴ محرم الحرام کو نہ ہو سکی، جمعہ ۵ محرم الحرام کو بعد مغرب اونٹوں پر ہوئی، اور داہ شغدف خیزران میں ساتھ تھیں، میرے قافلے میں چار شغدف خیزران تھے، ۱۳۴۵ھ کا انجام حج پر ہوا تھا، ۱۳۴۵ھ کا آغاز سفر مبارک مدینہ طیبہ سے ہوا، میرے ساتھ قافلے میں تین حاجی ایسے بھی تھے جو محض زیارت مدینہ طیبہ کی خاطر سے بادائے کرایہ میری جانب سے شریک قافلہ

کر لیے گئے تھے، ایک ان میں سے کئی سال سے شوق زیارت میں مکۂ مکرمہ میں مقیم تھے، یہ سعادت بھی حاصل ہوئی کہ تین صاحبوں کا عزم سفر مدینۂ طیبہ کا مذبذب ہوگیا تھا اور مکۂ مکرمہ ہی سے واپس ہند ہونا چاہتے تھے، میرے عرض والتجا پر راسخ الارادہ ہوکر مشرف بہ زیارت ہوگئے، مدینۂ طیبہ میں ان صاحبوں سے ملاقات ہوئی، ان کو دیکھ کر خاص سرور قلب کو ہوا۔

شام ۵ محرم الحرام روز جمعہ سے لیکر ۸ محرم الحرام روز پنجشنبہ کی مبارک صبح تک یہ سراپا سعادت مسافرت جاری رہی، قافلہ صرف اپنا ہی تھا، مہار دار والی پچھلی دلمن مرحوم بھی شریک قافلہ ہوگئی تھیں، کم و بیش ۳۰ اونٹ تھے، مغرب کی نماز روزانہ باجماعت اذان واقامت کے ساتھ ادا ہوتی تھی، کبھی کبھی ظہر کی جماعت بھی ہو جاتی تھی، پیچش کی تکلیف کا بقیہ ہنوز تھا، بار بار دست زیادہ تو نہ آئے مگر جو آتا پیچش اور درد کے ساتھ۔ بدون اجابت بھی درد کی زحمت ہو جاتی، خصوصاً تیسرے وقت شب کو، دن کو نیند کم آتی، شب کی بیخوابی کی تلافی دن کو دردانہ کے سلیقہ وغمخواری سے ہو جاتی تھی، خیزران شقدف مثل پالکی کے ہموار باقاعدہ بنا ہوا اور وسیع ہوتا ہے، رضائیاں اور کمل ڈالکر ایسا ٹھنڈا اور تاریک کر دیا جاتا کہ دوپہر کو آسائش سے نیند آجاتی، جزاہا اللہ تعالیٰ عنی خیر الجزاء، باوجود سفر غذا اور دوا کا اہتمام بھی دردانہ نے حسب اطمینان رکھا، رابغ کی منزل میں دو روز بغرض استراحت قافلہ کا قیام رہا، عائشہ بدوانی کا (جن کے مکان میں ہم اترے تھے) وقار اور اہتمام آسائش وحفاظت ساری عمر یاد رہے گا، جزاہا اللہ تعالیٰ عنا خیر الجزاء، میرے خاص جمال حامد، حمید اور محمد نامی تھے، تمام راستے میں ان سے سوائے محبت اور شفقت ورضاجوئی کے برتاؤ کے اور کوئی برتاؤ میں نے نہیں دیکھا، ان کی آسائش ورضاجوئی وبزرگ داشت کا اہتمام بھی حتی الامکان رکھا گیا، اللہ تعالیٰ ان کو کامیاب وبامراد رکھے۔

اس مبارک سفر میں حضرت شیخ عبدالحق دہلویؒ کی کتاب جذب القلوب الی دیار المحبوب

کا مطالعہ جاری رہا، ادعیہ انتخاب کرکے لکھیں، قابل زیارت مقامات کی یادداشت مرتب کی، حسب ارشاد شیخ درود شریف کا ورد کثرت سے رہا، بعد اہتمام نماز فرض یہی اہتمام تھا،

گیارہویں منزل بیر درویش تھی، اس کے بعد مدینۂ طیبہ میں حاضری کا شرف حاصل ہونے والا تھا، یہیں میری پیچش کی شکایت بھی رفع ہوگئی، درد وغیرہ سب جاتا رہا، اسی منزل میں مدینۂ منورہ سے واپس آنے والا ایک قافلہ ملا، میاں مصطفیٰ علی صاحب علوی کاکوروی نے مدینۂ طیبہ کے جان نواز پانی کی ایک صراحی عنایت فرمائی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

دانی چہ بود آب حیات دل مردہ — یک شربۂ آب از کف سقائے مدینہ
(مولانا محمد سعید عظیم آبادی رحمۃ اللہ تعالیٰ)

پہلی مرتبہ یہ روح پرور آب حیات نصیب حبیب ہوا، دل نے کہا کہ غریب پروری وعاجز نوازی نے ایک منزل بڑھ کر نوازش فرمائی، فال خیر ہے جس شب کی صبح کو حاضری مدینۂ طیبہ ہونے والی تھی، سارے قافلے میں جوش مسرت تھا، غسل کیا نئے کپڑے بدلے، عطر لگایا، بدوؤں نے بھی لباس بدلا، حامد میرے جمال اٹھائیسویں مرتبہ حاضر ہو رہے تھے، تاہم ایسے ہی خوش تھے، جیسے دوسرے نئے حاضر ہونے والے، پچھلی شب سے تلملانے والے بیدار ہوکر لباس بدلے ہوئے، پاپیادہ چل رہے تھے، میں بھی پیادہ ہولیا، ہمشیرہ صاحبہ نے ازراہ شفقت فرمایا "تھک جائیے گا سوار ہولو"، میں نے کہا میں بھی جانتا ہوں مگر اب سوار ہوکر سفر نہیں کر سکتا، اترنے کے بعد اول نماز تہجد ادا کی جوالحمدللہ پر کیف تھی، اس کے بعد پیادہ چلا اور بقیہ مسافت پیادہ طے کی۔

صبح صادق کی روشنی میں مبارک مسجد نبوی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے نورانی منارے دیدہ افروز، دلنواز اور جاں پرور ہوئے، فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔

چہ مبارک سحرے بود وچہ فرخندہ شبے — آں شب قدر کہ ایں تازہ براتم دادند
(حافظ)

قصد یہ کیا کہ نماز صبح مسجد شریف میں حاضر ہوکر ادا کروں مگر وقت نے تنگی کی لہذا تقاضائے

خوبی سے تکیہ مصری کی مسجد میں ادا کی، یہ پہلی نماز مدینہ طیبہ میں ادا ہوئی۔

یا رب مدینہ ست این حرم کز خاکش آید بوئے جاں | یا ساحت باغ ارم یا عرصۂ روضۃ الجنان
باشد نسیمش مشک سا، آبش زلال جانفزا | خاکش بود کحل جلا در دیدۂ اہل عیان
(جامی)

بعد نماز حاضر مسجد شریف ہوا، داخلی کی دعا پڑھکر اول تحیۃ مسجد محراب نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں ادا کی۔ پھر روضۂ اقدس پر حاضر ہوکر درود و سلام عرض کرنے کا شرف حاصل کیا، زہے سعادت زہے نصیب حبیب۔ فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔ جس نور و سرور کی نوید و تہنیت آغاز سفر سے پہلے ناموزوں شعر میں ملی تھی، اُس کا یہ مبارک آغاز تھا، شرف حضور کے بعد فرودگاہ پر آیا، یہ مکان حرم شریف سے چند ہاتھ کے فاصلے پر باب رحمت کے متصل تھا، در حرم سے حاضری کی سعادت حاصل ہوتی رہی۔ اس مکان کا نام بیت پشاوری تھا، افغانی نیاز بھی قائم رہا، یہ پنجشنبہ کا بابرکت دن تھا، بارک اللہ لنا فی یوم السبت والخمیس۔ اگلے دن یوم مبارک جمعہ تھا، نماز جمعہ مسجد شریف میں ادا کرنے کی برکت دلنواز ہوئی، فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔ اسی روز بعد دوپہر جناب سید حمزہ صاحب رفاعی، شیخ سلسلۂ رفاعیہ کی خدمت میں حاضر ہوکر ملاقات کی۔ یہ فیض آثار دولت خانہ حضرت امام حسن عسکری رضی اللہ عنہ کا (حسب بیان شیخ ممدوح) ہے، غایت شفقت سے حضرت شیخ نے پذیرائی فرمائی، اس کے بعد حاکم مدینہ منورہ سے ملا، یہ ابن رشید ہیں اور مدنیوں کے غمخوار، ان کے نائب سید حمزہ غوث بھی ان ہی صفات کے ہیں، جزاہما اللہ تعالیٰ عنا خیراً۔ بہت اخلاق سے ملے۔ بعد عصر بقعۂ مبارکہ جنۃ البقیع میں حاضر ہوا، سب سے اول حضرت ذی النورین عثمان الغنی خلیفۂ ثالث رضی اللہ عنہ کے مرقد مطہر پر حاضر ہوا، حاضر ہوتے ہی وہ عظمت و جلالت خلافت ظاہر ہوئی[1] کہ کھڑا رہنا اور سنبھلنا دشوار ہوگیا، دبدبۂ جلال سے دل لرزا جاتا تھا، خلاصہ یہ کہ اس

[1] حضرت شاہ احمد سعید صاحب مجددی کی وصیت تھی کہ مدینہ طیبہ میں ان کا انتقال ہو تو حضرت عثمانؓ کے قریب دفن ہوں۔ وہاں برکات اور انوار کا زیادہ ظہور ہے۔ (تذکرۂ کاملان رامپور از احمد علی شوق)

کیفیت کو بیان کرنا ممکن نہیں جو قلب پر جلال عظمت سے طاری ہوئی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ عنی۔

اسلام میں سب سے زیادہ باعظمت مزار ظاہر یہی ہے، حضرات خلیفۂ اول و ثانی رضی اللہ عنہما حجرۂ نبوت میں ہیں، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مزار پُرانوار کے تعیین میں اختلاف ہے، بلکہ نامعلوم ہے، اسکے بعد حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مرقد مبارک پر حاضر ہوا، حاضر ہوتے پر امومیت کی نسبت اس قوت سے قلب پر طاری ہوئی کہ بیان میں نہیں آسکتی۔ جوش رقت میں امی، امی کی صدا دل و زبان کے ساتھ گویا جسم کا ریشہ ریشہ دے رہا تھا اور روح محو ذوق تھی، بے شائبۂ تکلف محسوس ہوتا تھا کہ بچے نے مدت دراز کی مفارقت کے بعد شفیق ماں کو دفعۃً پالیا ہے، اور جوش محبت و احساس شفقت سے بیتاب ہوہو کر امی امی پکار رہا ہے، الفاظ کچھ ایسا ہی نقشہ کھینچ سکتے ہیں۔ غرض ایک عالم تھا جو اسی آستانۂ مرحمت کا شانے کے ساتھ مخصوص تھا، رضی اللہ تعالیٰ عنہا وارضاہا عنی۔ یہ دونوں کیفیتیں اپنی اپنی نوعیت میں عجیب و غریب تھیں۔ فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔

شنبہ کے روز صبح کو مسجد قبا اور بیر اریس پر حاضری ہوئی، مسجد قبا میں دوگانہ تحیت ادا کیا۔ نماز کے بعد بیر اریس کے قریب بیٹھکر ناشتہ کیا۔ وہیں کا پانی پیا۔ اس پانی کی لطافت و نفاست و عذوبت کیا بیان ہو، بظاہر کوثر و سلسبیل اور اریس ایک ہی سرچشمے کے چشمے ہیں، مدینہ طیبہ کے آب حیات کی یہ بھی تاثیر ہے کہ سرد ہونے کی اس قدر استعداد رکھتا ہے کہ جہاں رکھدو ٹھنڈا ہو جائے گا، مکانوں کے اندر بھی سرد ہو جاتا ہے، بارہا تجربہ کیا۔ اسی فیض بار کنوئیں سے نہر زرقا جاری ہے، جس سے اہل مدینہ طیبہ سیراب ہوتے ہیں۔

یکشنبہ کو بعد عصر حضرت شیخ حمزہ صاحب رفاعی کے دولتخانہ میں حلقۂ ذکر میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی، ذکر کلمہ طیبہ کا کھڑے ہوکر بالجہر آواز دف پر فرماتے ہیں۔

۲۳ محرم الحرام دوشنبہ کو کتب خانہ شیخ الاسلام دیکھا، شیخ ابراہیم حمدی خربوتی مہتمم ہیں۔ یہ ایک

عمدہ نمونہ اسلامی کتابخانوں کا ہے، عمارت خوبصورت، روشن اور ہوادار، عملہ مع سامان متقرر، مہتمم کارداں وسیع العلم اور دلسوز، کتابوں کی نگہداشت نورِ چشم کی مثل، آمدنی مستقل بذریعۂ اوقاف آستانہ (قسطنطنیہ اور جبال سلانیک وغیرہ) میں عمدہ زرخیز جائداد کی صورت میں تھی، آمدنی وافر تھی اور سالانہ باقاعدہ حاصل ہو جاتی تھی، دورِ جدید میں انتظام بے نظم ہو گیا۔ شیخ خربوتی نے اپنی وجاہت و تدبیر سے اس وقت تک انتظام قائم رکھا تھا، اول ناشتہ کی ضیافت نہایت سلیقے اور صفائی سے ہوئی، اس کے بعد کتابیں دیکھیں۔ کتابیں حسب ذیل تعداد میں تھیں:

قلمی نفیس ۱۴۰۶۳ - مطبوعہ ۲٬۷۳۲ - بعد وقف اضافہ ہوئیں ۱۰۲۲ - کل کتابیں ۱۷٬۸۱۷

یہ کتابخانہ شیخ الاسلام السید احمد عارف حکمت بک الحسینی نے ۱۲۷۰ھ میں بعہد سلطان عبد المجید خان قائم کیا تھا، مکان کتابخانہ شیخ شاہین سے خریدا گیا۔ شیخ شاہین کو سلسلہ بسلسلہ یہ مکان حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے ترکے میں سے پہنچا تھا۔ سالانہ مصارف کتابخانہ ۱۲۵۰ گنّی تھے، ایک جزء تفسیر عباسی کا ۳۱۶ھ کا لکھا ہوا ہے، کاغذ مثل چمڑے کے ہے، رنگ زردی مائل، خط ایسا ہے جیسا نسخ کچا ہو، بعد عصر امیر مدینہ کے یہاں بہ تقریب شادیٔ فرزند ممدوح کی دعوت میں شرکت کی۔ بعد دعوت بیر بضاعہ پر حاضر ہوا جو شام کے راستے کے قریب آبادی کے کنارہ پر ہے۔ پانی پیا۔

۲۳ محرم الحرام سہ شنبہ۔ بہ نشاندہی شیخ ابراہیم خربوتی امکنۂ مقدسہ کی جو جوار مسجد شریف میں ہیں زیارت کی۔ بیتِ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ مع مقام نشست ناقۂ مبارک، بیتِ العشرۃ المبشرۃ رضی اللہ عنہم (یہی مقام مشورہ گاہ حضرت امیر المومنین عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تھا) کوچۂ زقاق الحنابلہ میں حضرت سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کا بیت الاضیاف، اس کے ستون عہد مبارک کے بتائے گئے۔ ایک چھوٹا سا حجرہ اس میں ہے جو حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کا مصلی ہے جہاں نفل ادا فرمایا کرتے تھے، وہاں دو نفل ادا کرنے کا شرف مجھکو بھی حاصل ہوا، اسی کوچہ میں بعض خام مکان

دکھائے جو صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے مبارک عہد سے ابتک اپنی اصلی صورت میں قائم ہیں۔ ضروری مرمت ہو جاتی ہے، بصورت بدستور قائم ہے۔ ایک موقعہ اس بیمارستان کا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجاہدین کے لیے وقف فرمایا تھا۔ دوسرا بیت العجزۃ کا جو حضرت ممدوح کا وقف کردہ ہے، یہ موقعہ اس مکان کے بالکل سامنے تھا جس میں یہ عاجز قیام پذیر تھا، مسجد شریف میں شیخ خربوتی نے یہ مقدس مقام دکھائے، محرابِ تہجد حضرت سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ ستونِ ملاقات وفود، ستونِ نوافل حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔ خوخۂ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ صفہ۔ مسجد شریف کے تدریجی اضافے۔ جوار مسجد شریف میں مشہد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی بھی زیارت کی۔ سلطان نور الدین کا مزار دیکھا، جس کا دروازہ نجدیوں نے تیغہ کرا دیا ہے، شام کو بیر حاء اور بیر بصہ کی زیارت کی۔ یہ دونوں کنوئیں اندرون آبادی مبارک مسجد شریف سے تھوڑے فاصلے پر واقع ہیں۔ پانی پیا،

۲۴ محرم الحرام چہار شنبہ۔ صبح کو جبل مبارک احد کی زیارت سے مشرف ہوا۔ حضرت سید الشہداء حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پر انوار مزار پر فاتحہ پڑھی، مسجد میں دوگانہ ادا کیا۔ نیز حضرات شہدائے احد رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے مزارات [illegible] خیرات پر فاتحہ پڑھی۔ میدان احد میں پھر ایک چٹان کے سایہ میں آرام لینے کو بیٹھ گیا تھا، کہ دور سے روضۂ منورہ کے گنبد خضراء کا جلوۂ جانفزا دو سپید مناروں کے درمیان عجیب شان دلربائی سے باصرہ نواز و روح پرور ہوا، دیر تک اس جلوے سے میں فیضیاب رہا، فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔ حضرت شیخ دہلوی نے لکھا ہے (جذب القلوب میں)، کہ "گنبد شریف فاصلہ سے ایک خاص شان محبوبی کے ساتھ جلوہ فرما ہوتا ہے"۔ الحمد للہ تعالیٰ کہ یہ ناچیز پھر اس جلوۂ جاں نواز سے مشرف ہوا، میدان مبارک احد میں ایک بوٹی مع پھل اور خوشنما پھول کے ملی جس کو نور النبی صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں۔ میں نے

لے لی اور تفاول خیال کیا، ابتک پاس ہے (آج بتاریخ ۱۰ رجمادی الاول ۱۳۵۹ھ) زیارت کی،
ہنوز رنگ میں تازگی و نورانیت بدستور ہے، حالانکہ پندرہ برس گزر گئے) اب بھی ہرا ۱۳۶۲ھ

۲۵ر محرم الحرام پنجشنبہ۔ سلطان محمود خاں مرحوم کا کتابخانہ دیکھا، جو اہتمام میں شیخ الاسلام
کے کتابخانہ سے کم ہے، اس میں ایک نسخہ کلام مجید کا ۴۳۸ھ کا لکھا ہوا دیکھا۔ مسجد شریف میں
کلام مجید کا جو نسخہ قدیم ترمیں نے دیکھا وہ ۵۴۹ھ کا لکھا ہوا ہے، بخط ابوسعد محمد بن اسمٰعیل غزالی،
اسی روز شیخ احمد بساطی کا کتابخانہ دیکھا، اس میں کتاب المدخل امام بیہقیؒ کا نسخہ ہے، حفاظت کتب
کا بڑا اہتمام ہے۔

۲۶ر محرم الحرام، جمعہ۔ قبل نماز جمعہ بیر بضاعہ کی زیارت مکرر کی۔ غسل بھی بہ نیت ترقی صحت
کیا۔ یہ سنت بھی ہے۔

شنبہ، ۲۷ر محرم الحرام۔ مولوی عبد الباقی صاحب فرنگی محلی کا مدرسہ دیکھا۔ اس مدرسہ
کو ریاست حیدرآباد سے امداد ملتی ہے، اہتمام تعلیم غنیمت ہے، ناشتے کی ضیافت بھی مولانا
نے فرمائی، یہ مدرسہ اس دور میں علمی خدمت کر رہا ہے، مولوی صاحب کی ذات بھی مغتنمات سے ہے،
نجدیوں کی وحشت کا مقابلہ جرأت صداقت سے کیا، کلمۂ حق کے اظہار میں ڈرے نہیں جزاہ اللہ تعالیٰ
عن المسلمین خیر الجزاء۔ (۱۳۶۴ھ میں مولانا نے رحلت کی۔ غفرلہٗ)

یکشنبہ، ۲۸ر محرم الحرام۔ زیارت مسجد القبلتین، بیر رومہ و خندق سے مشرف ہوا، خندق
کے نشانات پہاڑ کے دامن میں ابتک صاف دیدہ افروز ہیں۔ امرائے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم
کے جہاں مورچے تھے، وہاں مساجد بنی ہوئی ہیں[له]، ان میں سے متعدد میں دوگانہ نفل ادا کیا،
نیز مسجد القبلتین میں، مسجد الفتح، مسجد ابی بکر، مسجد عمر، مسجد علی اور مسجد سلمان الفارسی رضی اللہ عنہم اجمعین

[له] مسجد الفتح، مسجد ابی بکر، مسجد عمر، مسجد علی، مسجد سلمان الفارسی۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

ان پانچوں مساجد کی زیارت کی اور جہاں تک یاد ہے، تین میں دوگانہ بھی پڑھا،

۳ر صفر المظفر، جمعہ۔ حضرت شیخ دہلوی قدس سرہ نے جذب القلوب میں تحریر فرمایا ہے کہ حاضری
مدینہ طیبہ کی سعادت نصیب ہو تو مسجد شریف میں شب بیداری کی سعادت بھی حاصل کرے، اسی بنا
پر میں نے مولوی ندیم احمد صاحب مجددی سے اپنا ارادہ ظاہر کیا تو موصوف نے حضرات اغوات
سے التماس کر کے انتظام کرا دیا۔ ۱۰ بجے شب کو مسجد شریف کے دروازے معمور ہو جاتے ہیں اور
بلا اجازت محافظین کوئی اندر نہیں رہ سکتا، خلاصہ۔ شب موصوف کو حاضری کی اجازت مجھکو
بھی حاصل ہو گئی، جوں جوں وقت قریب آتا دل پر ہیبت سی طاری ہوتی جاتی تھی، یہ خیال
بھی آتا تھا کہ کہیں نیند نہ آجائے، حضرت شیخ نے خصوصاً یہ ہدایت فرمائی ہے کہ حاضری نصیب ہو
تو اہتمام بیداری رکھا جائے، ایسا نہ ہو غلبۂ خواب، غفلت میں شب گزار دے، بے چینی بڑھی
تو حضرت پیر و مرشد قدس سرہٗ کی جانب توجہ کی، الحمد للہ تعالیٰ اطمینان حاصل ہوا،

حاضری شب کا اہتمام کر کے نماز عشاء کے واسطے حاضر مسجد شریف ہوا، صحن میں چونکہ نشست ہوتی
اسلیے اپنے لیے شمعدان اور موم بتی کا بھی اہتمام کر لیا تھا، خلاصہ۔ نماز عشاء سے فارغ ہو کر صحن میں
تلاوت کلام مجید شروع کی، ملاجی بھی تھے، نیز معتقد نبی خاں، ان دنوں جو دور کلام مجید تلاوت میں
تھا اس میں ۲۴ ½ پارے ہو چکے تھے، بقیہ ساڑھے پانچ پارے اس موقع پر ختم کر کے پورے
کلام مجید کی تلاوت کا ثواب بارگاہ رسالت پناہ میں پیش کیا، اس کے بعد نفل پڑھی، پھر دور شریف
بھی دور تمام شب رہا، نماز تہجد بھی ادا ہوئی، صبح کی نماز عشاء کے وضو سے ادا کی، تمام شب نہایت
سکون اور اطمینان سے بفضلہ تعالیٰ بسر ہوئی، تکان یا نیند کا شائبہ بھی نہ تھا، دس بجے دروازے
معمور ہو گئے تھے، روشنی گل کر دی گئی تھی، ایک قندیل روضۂ مبارک میں روشن نظر آتی تھی ممکن
ہے اور بھی روشن ہوں، جو پیش نظر نہ تھیں، علاوہ ملاجی اور معتقد نبی خاں کے ایک بخاری کو بھی

اجازت ملی تھی، ان کے پاس شمع نہ تھی، میں نے اپنی شمع کے قریب بلا کر بٹھا لیا، وہ بھی تلاوت کرتے رہے کیا مبارک شب تھی، کیا مبارک سحر۔ ؎

ضیا بخشی رخِ پرنور نے صبحِ بہاراں کو   دل آرا کر دیا زلفِ معنبر نے شبستاں کو
(حسرت شروانی)

بعد نماز صبح مکان میں آکر سویا، کیا بیداری سعادت تھی اور کیا خواب راحت۔ فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔ وصلی اللہ تعالیٰ علی رسولہ الکریم وسلم۔

جو شمعدان اس مبارک شب میں، میں نے روشن کیا تھا وہ مع بقیہ موم بتیوں کے لا کر حبیب گنج کی مسجد میں، روشن کر دیا۔

شنبہ ۴، صفر المظفر۔ زیارت مسجد قبا کر کر و زیارت مسجد الجمعہ و قبہ بنات النجار رضی اللہ تعالیٰ عنہن۔ ایضاً بیر العہن و بیر الغرس۔ دو ضیافتیں بھی آج شرف افزا ہوئیں۔ ایک بیر الغرس پر، یہ کنواں ایک حسینی شریف کے باغ میں ہے، زیارت بیر کے موقع پر ممدوح سے بھی شرف ملاقات حاصل ہوا، بزرگانہ اخلاق مبذول فرمایا، قہوہ اور رطب کی ضیافت سے مشرف فرمایا، حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی اولاد میں ہیں، شیخ علی کابلی نے جب اس سلسلۂ پاک کا تذکرہ کیا تو شریف نے فخریہ لہجہ میں اپنی چھوٹی سی بچی کی طرف (جو پاس بیٹھی تھیں) اشارہ فرما کر کہا کہ حسین رضی سے لیکر اس لڑکی تک سلسلہ مسلسل ہے، شجرۂ نسب بڑے بھائی کے پاس ہے جو شہر میں ہیں، وہاں دیکھ سکتے ہو، میں نے شریف ممدوح کی پاکیزہ آنکھوں میں ایک ایسا جلوۂ پاکیزگی و نفاست دیکھا جو عالم علوی کا ایک نظارہ محسوس ہوتا تھا، دوسری ضیافت بیر العہن پر، یہ کنواں مشہور شیخ علی شحاد کے باغ میں ہے، یہ شیخ جوالمردان حجاز سے ہیں، ترکوں کے عہد ان کا بھی دور رہا، اب مجبور ہیں، مجھ سے کہا کہ بدوؤں کی طمع نے سونے سے مغلوب ہو کر میرا ساتھ چھوڑ دیا، ورنہ ابن سعود مدینہ پر قابض نہ ہوتا، قصہ مختصر، ہم باغ میں اجنبیانہ داخل ہوئے اور بر چمن کے قریب بیٹھ کر صبح کا ناشتہ شروع کیا۔ شیخ علی کابلی ساتھ تھے، جو شیخ شحاد

کے ہم زلف ہیں، خادموں نے ان کو پہچانا اور اپنے آقا کو خبر کی، معاً آدمی بھیجکر اپنے پاس بلا لیا، خانہ باغ میں تھے، یہ مکان بہت پر فضا، ہوادار وسط باغ میں تھا، قالینوں اور ہتھیاروں سے آراستہ تھا، ہم نے وہیں ناشتہ کیا، شیخ نے اس پر اظہار ندامت کیا کہ ہم ان کے مکان میں اپنا کھانا کھا رہے تھے، قلت فرصت ان کے یہاں کھانا تیار ہونے سے مانع تھی، کھانے کے اثنا میں خادم نے مجھکو پانی گلاس میں دیا تو کہا کہ میرے پانی پینے کے برتن میں دو۔ یہ برتن بیضاوی ناریل کے پوست کا سیاہی مائل دانہ دار تھا، کھانے کے بعد تلواریں دکھائیں، ایک اصفہانی عمدہ تھی، میں نے تعریف کی تو کہا بطور نشانی کے لیجاؤ، میں نے انکار کیا تو اصرار ہوا، مولوی ندیم احمد صاحب نے خوبصورتی سے ٹال دیا، یہ کہا کہ ہندوستان میں جاکر بیکار ہو جائیگی، یہ سنکر شیخ کی آنکھوں میں ایک چمک آگئی اور کہا کہ اس سے بہت سر اڑائے ہیں، پھر باغ دکھایا، آبپاشی کیلئے تیل کے انجن لگے تھے، نارنگیاں بھی تھیں جو مصر سے منگا کر لگائی ہیں، انکا نام "یوسف آفندی" تھا، چکوترے کے درخت بھی تھے، جس کو "بُرتقان" کہتے تھے، گھوڑے دکھائے، ایک بچھیری کمیت رنگ کی بہت نفیس تھی، اصرار کیا اسے لے جاؤ، راستے کی دقت میں نے بیان کی تو خاموش ہو گئے،

یکشنبہ، ۵، صفر المظفر۔ مولوی سید احمد صاحب فیض آبادی کا مدرسہ دیکھا، ابتدائی تعلیم کا ہے اچھی خدمت کر رہا ہے، طلباء کو صناعی بھی سکھائی جاتی ہے۔

دوشنبہ، ۶، صفر المظفر۔ آج صبح روضۂ مبارک کے خدام، میرے اور سارے عالم کے مخدوم اغوات لے میرے قیام گاہ پر قدم رنجہ فرما کر ضیافتِ چاء قبول فرمائی، مجھکو شرف و کرم فرمایا، عجیب با ادب اور سلیقہ شعار بزرگ ہیں، کیسے ادب اور قاعدے سے خدمت روضۂ مبارک ادا فرماتے ہیں، جن کو دیکھکر دل عش عش کرتا ہے، ایک موقعہ پر جب حاجی احمد مرحوم بمبئی کے باخیر سیٹھ نے اپنے مکان میں دعوت میں مجھکو بھی بلایا تھا، تو آغا سرور شیخ الاغوات صدر نشین تھے، میں پہلو میں قریب حاضر تھا، اثنائے کلام میں میں نے پوچھا کہ کس قدر زمانے سے، روضۂ مبارک پر حاضر ہیں، فرمایا ۶۵ برس سے۔

سعادتِ خدمت حاصل ہے، سات برس کی عمر میں حاضر ہوگیا تھا، یہ سنکر ممدوح کی طہارت کا اسقدر تصور بندھا کہ مجھکو اپنا وجود نجس محسوس ہونے لگا اور میں شیخ کے قریب سے علٰحدہ ہوگیا، جس طرح طاہر جسم کو نجاست سے بچاتے ہیں،

سہ شنبہ۔ ۷ صفر المظفر۔ صبح کو مسجد غمامہ میں دوگانہ نفل ادا کیا، یہ مسجد اُس موقعِ مبارک پر تعمیر ہوئی ہے جہاں حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نماز عید ادا فرماتے تھے۔

چہار شنبہ۔ ۸ صفر المظفر۔ بعد عصر امیرِ مدینہ ابراہیم الصعہبان ابن الرشید سے رخصتی ملاقات کی،

پنجشنبہ۔ ۹ صفر المظفر۔ مدینہ طیبہ کی آبادی کے اندر حضرت عبداللہ بن عبدالمطلب اور حضرت مالک ابن سنان کے مزاروں کی زیارت کی۔ دروازے نجدیوں نے تیغہ کرادیے ہیں، باہر سے فاتحہ پڑھی، اس روز قاری حسن الشاعر السیوطی کے رسالۂ قرأت کا آخیر سبق شیخ ممدوح کی خدمت میں مسجد شریف نبوی میں پڑھا، شیخ اس وقت مدینہ طیبہ کے قرّاء میں درجۂ امتیاز رکھتے ہیں،

جمعہ۔ ۱۰ صفر المظفر۔ دوران حاضری مدینہ طیبہ میں عرض درود و سلام کا یہ طریقہ رہا کہ شروع میں تو مزدور زائرین کے ہمراہ چند بار روضۂ مبارک کے قریب حاضر ہوکر یہ شرف حاصل کیا، لیکن اس کے بعد قریب حاضر ہونے کا قصد ہی نہ ہوتا تھا، نہ جرأت ہوتی تھی، دور سے باادب ایستادہ ہوکر عرض کرلیتا، برابر یہی طریقۂ ادب ملحوظ رہا، اسی اثنا میں ایک موقع پر جناب مدیر حرم شریف نے روضۂ منورہ میں داخلی کی مجھ سے تحریک فرمائی، تو میں ہیبت زدہ سا ہوگیا، اور اپنی نااہلی ظاہر کرکے معذرت کی، نماز جماعت میں بھی روضۂ مبارک کی جالی کے قریب کھڑے ہونے کی جرأت نہ ہوئی، مدینہ طیبہ میں ایک مہینہ حاضر رہنے کا پورا انتظام تھا، یہ بابرکت زمانہ پورا نہ ہوا تھا کہ جدہ میں جہانگیر جہاز کے پہنچ جانے کی تاریخ کی اطلاع مدینہ طیبہ پہنچی، اس خبر کے ساتھ کہ جہاز آخیر ہے، اس کے بعد ایک مہینہ تک جہاز نہ ملے گا، وہ بھی مال کا ہوگا، جو بندرگاہوں پر ٹھہرتا ہوا جائے گا۔

مدینہ طیبہ سے حجاج کے قافلے تو پہلے ہی جاچکے تھے، اس وقت صرف اپنا ہی قافلہ بظاہر وہاں تھا، اسلیے اہل قافلہ میں بےچینی ہوئی اور چلنے کی تحریک کی، حکیم تفضل حسین خاں صاحب نے زیادہ اصرار کیا، میں چونکہ حکیم صاحب کے معالجے کا ممنونِ کرم تھا، اس لیے ان کے اصرار پر لحاظ کرنا پڑا اور قصدِ مراجعت قبل از وقت ہوگیا۔

جمعہ۔ ۱۰ صفر المظفر تاریخ روانگی قرار پائی۔ اس قرارداد سے دل پر عجب افسردگی طاری ہوئی، پنجشنبہ کی شب کو کھانا کم کھایا تھا، ایک بجے شب کو سوتے سے آنکھ کھل گئی تو فرطِ وحشت و قلق سے قلب کا عجب حال تھا، صبح کو مسجد شریف میں حاضر ہوا تو دل بھرآیا، چند قدم چل کر بےاختیار رُو پڑا، رو لہجے میں "یارسول اللہ" زبان سے نکلا۔ اب چلنے کی بھی تاب نہ رہی، کھڑا ہوگیا اور فرطِ غم سے قریب کے ستون شریف سے سر کو ٹیک دیا، اس رنج اور صدمے کی حالت میں دیر تک ساکت کھڑا رہا، بالآخر نماز صبح ادا کی اور بعد نماز صحن مبارک میں بیٹھکر پڑھنے میں مصروف ہوگیا، دل بدستور مضطرب تھا، اسی عرصے میں خدام کرام روضۂ اطہر سے روشن قندیلیں باہر لانے اور ذخیرے کے مکان میں لیجانے لگے۔ اسی سلسلے میں ایک صاحب میرے متصل ہوکر تشریف لے گئے، ان کے ہاتھ میں ایک کشتی تھی، اور اس میں روشن کنول رکھے ہوئے تھے، اس اتصال سے قلب میں ایک کیف پیدا ہوکر یہ داعیہ پیدا ہوا کہ روضۂ مبارک میں داخلی کا شرف حاصل کرنا چاہیے، اول تو اس خیال پر گونہ استعجاب ہوا، مگر آہستہ آہستہ یہ مبارک خیال غالب و دلنشین ہوتا گیا، یہانتک کہ مصمم ہوگیا، بعد تصمیم مولوی ندیم احمد صاحب سے ظاہر کیا، موصوف نے ازراہ کرم انتظام فرمادیا، جمعہ کی شب کو حسب ارشاد حضراتِ خدام خلاف معمول نماز بوقت امام شافعی رضی اللہ عنہ ادا کی اور بعد نماز حضرات ممدوح کی خدمت میں حسب قرارداد حاضر ہوگیا، بعد حاضری وہ لباس شریف زیب بدن فرمادیا گیا جو یہ حضرات بوقت خدمت استعمال کرتے ہیں، یعنی ایک صاف سپید

نیچا جبہ (فرجیہ) آستین چوڑی، اور عربی عمامہ۔ یہ لباس پہنا کر اس چبوترے پر بٹھا دیا جو ان حضرات کی نشست کے لیے مخصوص ہے، تصور کرو میری اس عزت و شان کا جب میں اس مبارک ہیئت سے منتظر خدمت و حاضری درگاہ ملائک پناہ، موقفِ خدمت میں حاضر تھا۔ دل میں سکون و عجز کی کیفیت تھی، بالآخر خدام کرام حسب قاعدۂ مقررہ غایت ادب کے ساتھ روضۂ اقدس کے باب معلّٰی پر حاضر ہو کر صف بستہ ایستادہ ہوئے، زہے شرف کہ یہ عاجز بندہ بھی اس باشرف صف میں تھا، کلید بردار خادم سب سے آگے ایستادہ تھے، ان کے گلے میں بھاری چاندی کی زنجیریں آویزاں تھیں، جن میں بڑی بڑی کنجیاں تھیں، سب نے اول درود و سلام عرض کیا، پھر بعد استیذان در سعادت کھولا، سب خاموش نیچی نظر کے ساتھ آہستہ بدن کو سمیٹے ہوئے داخل ہوئے، ایک سپید تر کیا ہوا رومال میرے ہاتھ میں پہلے سے دیدیا گیا تھا، اندر داخل ہونے کے بعد ایک صاحب نے قندیل زجاجی کے پاس پہنچکر اس میں سے روشن کنول نکال کر دوسرے صاحب کو دیا، قندیل میرے سامنے جھکا دی، میں نے رومال سے صاف کردی، اسی طرح درود و سلام آہستہ پڑھتے ہوئے پھر کر قندیلیں صاف کیں، مقام صدر اشرف کے قریب حاضر ہوئے تو کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھی، ثواب پیش کیا، اس کے بعد حضرت سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مرقد مبارک کے قریب حاضر ہو کر فاتحہ پڑھی، یونہی آہستہ آہستہ درود و سلام پڑھتے خدمت کرتے باہر آگئے، ادب نے نگاہ کو اتنا قابو میں رکھا کہ باہر آنے پر یہ بھی نہ معلوم ہوا کہ کیا دیکھا، فرط ادب سے نگاہ فرش مقدس پر بھی نہ جمی لہٰذا اس کی ہیئت بھی ذہن میں نہ تھی، باہر آنے پر قلب میں پورا سکون تھا، مفارقت و مہاجرت کا تصور بھی نہ رہا، قلب کو طمانیت کامل ہوگئی، فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیبا مبارکاً فیہ، اللھم صل علی سیدنا محمد وعترتہ بعدد کل معلوم لک۔ اس سعادت کے حصول کے بعد مکان پر آیا، وہاں شیخ حسن الشاعر المقری نے بھی کرم فرمایا، ناشتے کے بعد موصوف کے ساتھ مسجد شریف

میں حاضر ہو کر سورۂ فاتحہ سنائی، بعد عطاء سند شیخ ممدوح نے فاتحۂ خیر و دعا سے مشرف فرمایا، فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیبا مبارکاً فیہ، جمعہ کی نماز کے وقت منبر شریف سے بالکل متصل بیٹھنے کو جگہ مل گئی جو اب تک نہ ملی تھی، خطبہ باطمینان سنا، نماز کے وقت تیسری صف میں کھڑا، دو یا تین مصلّی میرے اور مبارک جالی کے درمیان میں تھے صفیں درست ہونے پر اگلی صف میں ایک جگہ خالی ہوئی، میں وہاں پہنچ گیا، اب جالی شریف اور میرے درمیان میں ایک مصلّی تھے، اس کے بعد اول صف میں جگہ خالی ہوئی۔ میں وہاں حاضر ہو گیا، اب جالی شریف اور میرے درمیان میں کوئی حائل نہ تھا، اسی قرب کے ساتھ نماز جمعہ ادا ہوئی، فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیبا مبارکاً فیہ، یہ اس باسعادت قیام میں جمعہ کی آخیر نماز تھی،

دو چار روز قبل خدام کرام کے ساتھ مسجد شریف میں جاروب کشی کا شرف بھی حاصل ہوا تھا، اور یہ شرف بھی کہ اس خدمت کے بعد خدام کرام نے مولوی ندیم احمد صاحب سے میری غیبت میں فرمایا کہ "شیرینی لاؤ، ہم میں شامل ہوگئے"۔ اتفاق حسنہ دیکھو بروز جمعہ موصوف ایک صاحب چند جاروبیں فروخت کے لیے اس قسم کی لائے جو کسی زمانے میں خاص روضۂ اطہر کی جاروب کشی کے لیے قسطنطنیہ سے تیار ہو کر آیا کرتی تھیں، اب موقوف ہو چکی ہیں، میں نے ایک اشرفی پیش کر کے لیں، اور خدام کرام کی نذر کردیں، یہ اتفاق حسنہ قبول خدمت جاروب کشی کا مژدہ متصور ہوا،

عصر کی نماز کے بعد روضۂ اقدس پر حاضر ہو کر الوداعی درود و سلام عرض کیا گیا، اہل قافلہ صدمۂ مفارقت سے بے چین مصروف آہ و بکا تھے، میرا قلب الحمد للہ تعالیٰ سکینۂ حضور محسوس کر کے مطمئن تھا، تصور مفارقت ہی نہ تھا اور آج تک بھی نہیں ہے، فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ، بعد نماز عصر قافلہ مع الخیر جدہ کو روانہ ہوا۔

مدینہ طیبہ میں ۲۳ دن تک شرفِ حضور حاصل رہا، ایک عجیب واردات ہے، حج سے قبل
ایک قافلہ زیارت مدینہ منورہ سے مشرف ہوکر مکہ مکرمہ پہنچا تھا، اس میں کے ایک صاحب سے جو
بہار کے رئیس تھے، شاہ ابوشرف صاحب مجددی کے دولت خانے پر ملاقات ہوئی، اثنائے کلام میں
میں نے پوچھا کہ مدینہ طیبہ میں کس قدر حاضری رہی، مسرور ہوکر کہا الحمد للہ اکیس دن، مجھکو تمنا ہوئی
کو کاش مجھکو بھی طویل مدت حضور نصیب ہو، اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے یہ تمنا بھی پوری فرمادی،
حالانکہ مکہ مکرمہ میں مطوف ترک نے بلا اطلاع صرف چار دن کے قیام کا معاہدہ بدوؤں سے کرلیا تھا،
بجائے ۲۱ دن کے ۲۳ دن کے قیام و حضور کا شرف حاصل ہوگیا، فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ،
چار جمعے مسجد شریف میں ادا ہوئے، دوران قیام میں تمام نمازیں باجماعت مسجد شریف میں (جہاں تک
یاد ہے) ادا ہوئیں، شہر مدینہ طیبہ اور نواح کے مقامات پاک میں سیر و مشی کی خوب سعادت
حاصل ہوئی، روزانہ بعد نماز صبح مشی کرتے ہوئے ہم مل کر مناخہ جاتے ترکاری، میوہ، شہد وغیرہ
خریدتے، شام کو بازار میں جاتے، ایک روز مولانا عبد الباقی فرنگی محلی نے بازار میں دیکھ کر فرمایا
یہ بھی سنت ہے، ان مقامات میں بھی حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قدم رنجہ فرمایا ہے،
کتابیں کئی خریدیں، ان پر مدینہ طیبہ کی خریداری کی یادداشت لکھ کر داخل کتبخانہ حبیب گنج کیں،
علیٰ ہذا القیاس مکہ مکرمہ کی خرید کردہ دو کتابیں رجال حدیث کی حسن اتفاق سے جدہ میں ہدیۃً
ملیں، اس طرح ان تینوں مبارک شہروں کی یادگار قیام حبیب گنج کے کتاب خانے میں ہے،
مسجد شریف میں یہ تین سعادتیں بھی حاصل ہوئیں، امامتِ صلوٰۃ، ایک روز صبح کو (غالباً حاضری
کے دوسرے دن) ایسے وقت مسجد شریف میں صف جماعت میں حاضر ہوا کہ امام سلام پھیر رہے تھے،
میں تنہا فرض پڑھنے لگا، تو دو تین مصلی اور موجود ہوگئے اور باصرار مجھکو امام کیا، تصحیح نسخہ کلام مجید
قلمی، مسجد مبارک کے کتاب خانے میں ایک نسخہ کلام مجید کا نواب عبد المجید خانصاحب مرحوم ٹونکی

کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، جو نواب وزیر الدولہ مرحوم کے داماد تھے، خوشخط مطلا ہے، ایک روز شیخ الروضہ
مہتمم کتاب خانہ نے وہی نسخہ تلاوت کے لیے مجھکو عنایت فرمایا، منبر شریف کے قریب میں تلاوت میں
مصروف ہوا، اثنائے تلاوت میں ایک سے زیادہ کتابت کی غلطیاں معلوم ہوئیں، مثلاً آیۂ پاک
"قُلْ إِنَّ الْهُدَىٰ هُدَى اللَّهِ" میں لفظ اللہ چھوٹ گیا تھا، یہ غلطیاں شیخ الروضہ کو میں نے بتائیں
تو بعد اطمینان دعائے خیر دیکر صحیح کردیں۔

اجازت روایت حدیث شریف۔ شیخ عمری سے میں نے مسجد شریف میں اجازت حدیث شریف
حاصل کی تھی، اجازت کے بعد شیخ ممدوح نے مجھ سے اجازت کی فرمائش کی، میں نے خجالت کے ساتھ
اپنی بے مائگی کا عذر کیا، اس پر بھی الحاح فرماتے رہے، مجبور ہوکر میں نے خیال کیا تو ایک حدیث شریف
خیال میں آگئی جس کی اجازت حضرت پیر و مرشد قدس سرہٗ نے اس وقت فرمائی تھی، جب میں
اور شیخ احمد مکی مرحوم مل کر ایک بار حاضر خدمت شریف ہوئے تھے، یہ حدیث مسلسل بالاولیۃ
حضرت کو حضرت شاہ عبد العزیز قدس سرہٗ کی اجازت سے ملی تھی، حدیث موصوف کے یہ الفاظ
یاد تھے، المتحابانِ فی اللہ تعالیٰ تحت ظل العرش یوم لا ظل الا ظلہ۔ اس حدیث شریف
کی اجازت سے شیخ ممدوح بہت ہی خوش ہوئے، اور فرمایا میری سند سے عالی ہے،

شیخ عمری فقیر منش، آزاد روش قانع عالم ہیں، مولوی سید سلیمان ندوی نے مدینہ طیبہ میں
ممدوح کی مجھ سے تعریف کی تھی، میرے اظہار اشتیاق پر فرمایا کہ ملنے میں بہت محتاط ہیں، یہ سنکر
میں چپ ہوگیا۔ ایک روز اتفاقاً ملاقات ہوگئی، فقیرانہ لباس، درویشانہ صورت و سیرت،
اہل اللہ کا سا استغنا، سلفِ صالحین کے اخلاق کا نمونہ۔ مل کر ایسے مانوس ہوئے کہ اکثر ملتے رہے،
مکان پر بھی تشریف لاتے رہے، مطالعہ بہت وسیع ہے، معلومات مستحضر، مطالعہ کا شوق اب بھی
ہے، کتابوں سے بہت آگاہی ہے، خریداری کتب میں بہت مفید مشورہ دیتے رہے، شوقِ مطالعہ

کی تعریف شیخ خربوتی نے بھی کی، حضرت شاہ عبدالغنی مجددی قدس سرہ العزیز سے تلمذ بیعت ہے، کہیں سے دس روپئے ماہوار ملتے ہیں، ان ہی پر بشدت قانع ہیں، خربوتی نسبت ہے خربوت کی جانب جو کردستان کا ایک حصہ ہے، شیخ ابراہیم خربوتی مہتمم کتاب خانہ شیخ الاسلام نہایت مہذب اور متین، شگفتہ مزاج اور ماہر ہیں، کتابوں کی نگہداشت نہایت شفقت واہتمام سے مثل بچوں کے فرماتے ہیں اور اس فن میں ماہر ہیں، میرے حال پر بہت مہربان رہے، کتاب التقصی امام ابن عبدالبرؒ کی، موصوف کی عنایت سے نقل ہو کر میری مراجعت کے بعد میرے پاس پہنچی۔ جزاہ اللہ تعالیٰ عنی خیرالجزاء۔

موسم رُطب

یہ بھی ایک فضل ربانی تھا کہ میری حاضری ایسے زمانے میں ہوئی جو مدینہ طیبہ میں رطب کی بہار کا تھا، باغات عوالی مدینہ شریف میں کثرت سے ہیں، عموماً ہر باغ میں کنواں اور پختہ حوض ہوتا ہے، زیر درختی کاشت رزقہ (لوسن) کی ہوتی ہے، بھنڈی، کریلہ وغیرہ ترکاریاں بھی پیدا ہوتی ہیں، نیز پودینا، ہرا دھنیا، اس طرح باغات کی زمین عموماً سرسبز رہتی ہے، کھجوروں کے درخت رُطب سے لدے ہوئے تھے، اقسام اقسام کی کھجوریں دیکھیں اور کھائیں، عجوہ کھجور تلاش کر کے اور درخت کے نیچے کھڑے ہو کر کھائی، جس باغ میں دل چاہا بے تکلف چلے گئے، مالک باغ کو عموماً خیر مقدم کے لیے کشادہ پیشانی مستعد پایا۔ اہلاً، سہلاً، مرحبا کے بعد محبت سے بٹھاتے، چائے اور کھجور کی ضیافت سے مشرف فرماتے، کھانے کی فرمائش فرماتے، شیخ عبدالقادر حجار کے باغ میں دوپہر کا کھانا بھی کھایا، صبح کی اور سہ پہر کی چائے پی، اہل مدینہ اس موسم میں مع اہل وعیال باغوں میں قیام کرتے ہیں، اکٹھے ہوتے ہیں، خوش الحان نعت شریف سناتے ہیں، شیخ حجار کے باغ میں ایک بڑا پختہ حوض شفاف پانی سے چھلک رہا تھا، اس کے کنارے پر وسیع ہوادار مجلس تھی، مجلس کے کناروں پر خوشنما چھینٹ سے منڈھے ہوئے نرم گدے تھے، درمیان میں سرتاسر ایرانی خوشنما قالین

کا فرش تھا، جو لوگ تیراک تھے، حوض میں تیرنے، ملاجی سے اور شیخ سے اثنائے غسل میں تفریحی ہاتھا پائی بھی ہوئی۔

باوجود پیرانہ سالی شیخ حجار بہت ہی ظریف وخوش طبع ہیں، مہمان نوازی، زندہ دلی، نرم خوئی، شیریں زبانی اور پاکیزگی وصفائی اہل مدینہ طیبہ کے عمومی اوصاف ہیں، بہار رُطب اور باغات کو دیکھ کر حدیث وادب کے بہت سے مضامین عیاں ہو گئے۔

عمارات مدینہ طیبہ عموماً بلند اور وسیع سنگین ہیں، خصوصاً محلہ ساحہ کی عمارات بہت ہی عالی شان ہیں،

ایک روز وادی العقیق کی بھی سیر کی، بعض قصور کے کھنڈر ابتک باقی ہیں،

۱۰ رصفر المظفر یوم جمعہ کو بعد نماز عصر مدینہ طیبہ سے واپسی ہوئی تو اسٹیشن کے قریب شام ہو گئی تھی، جرک والوں نے حجت کی، حکومت کو ٹیلیفون کیا تو حکم آیا فوراً قافلے کو جانے دو، چنانچہ اس پر قصہ طے ہوا، نماز مغرب بیر علی کے قریب پڑھی، منزل بہ منزل سیدھے جدہ آئے،

آثار

اب چونکہ حج وزیارت سے بفضلہ تعالیٰ مشرف ہو لیے اس لیے اس کے بعد کے واقعات آثار کے تحت میں لکھے جاتے ہیں۔

۱۹ رصفر المظفر کو صبح کے وقت جدہ پہنچے، جدہ کے بازار اُس وقت طائف کے انگوروں سے بھرے ہوئے تھے، قسم قسم کے انگور اور ارزاں، فضل باری تعالیٰ دیکھو بمبئی میں آموں کی بہار تھی، مدینہ طیبہ میں رُطب کی، جدہ میں عنب کی، جدہ میں پانچ دن قیام رہا، "نانا حوا" کے مزار پر حاضر ہو کر جناب عم مغفور مولوی محمد عبدالشکور خاں صاحب رئیس بھیکن پور کی روح کو فاتحہ کا ثواب بخشا، نیز دیگر رفقائے قافلہ مرحوم مغفور کو۔ قصد کیا کہ ہم دوبارہ موٹر پر مکہ مکرمہ حاضر ہو کر عمرہ کرنے کا شرف حاصل کیا جائے، مگر موٹر کا انتظام نہ ہو سکا۔

جمعہ ۴؍ صفر المظفر کو جہاز جہانگیر پر سوار ہوئے، جہاز کا نام کامیابی کی فال خیر تھا، روانگی سے قبل مولوی ندیم احمد صاحب مجددی طائف کے انار اور ترکاریاں لاکر اہل جہاز کو تقسیم فرما گئے، انار اس قدر لطیف تھے کہ میں نے ایک مثل آم کے مولوی ندیم احمد صاحب کے اصرار پر چوسا، تمام دانے عرق ہوگئے، صرف باریک پوست ہاتھوں میں رہ گیا، اثنائے راہ میں عدن اور مکلا کی سیر کی، بندر عدن میں یاسین خاں صاحب سشن جج جہاز پر آکر شہر کو لے گئے، سیر کے بعد شب کا کھانا بھی کھلایا، موصوف علیگ ہیں اور خاندان کنبوہ کے فرد، ہوشیار، بااخلاق، مکلا خوشنما بستی ہے، جہاز میں میرے ہونے کی خبر پاکر سلطان نے مدعو کیا، لینے کو معتمد بھیجے، کنارہ پر موٹر موجود تھی، حیدرآباد کے تعلق کے لحاظ سے بہت اخلاق سے پیش آئے، کپتان کو بھی پکڑ بلایا تھا، تاکہ جہاز کی روانگی کے خیال سے ملاقات میں تنگی نہ ہو، جہاز پر واپس آجانے کے وقت دعوت بھیجی، شہد، قہوہ، بکرے، دنبے اور متوا ایک بڑی ایرانی قالین کی جانماز، بکرے یہاں آئے ہیں اور ان کی نسل لی گئی ہے، جو انشاء اللہ اس مبارک سفر کی یادگار رہے گی۔

جہاز براہ کراچی آیا، عدن خاص ضرورت سے گیا تھا، راستے میں ایئر اول (کاٹھیاواڑ) کا بندر پڑتا ہے جس کے متصل سومنات کے شہداء کے مزار ہیں، رحمہم اللہ تعالیٰ۔ روانگی اسی راہ سے ہوئی تھی، واپسی میں اطلاع ہونے پر قلب کو سخت تعلق ہوا اور فاتحہ خوانی کو دل چاہا، کپتان نے مہربانی سے موقع بتانے کا وعدہ کیا، خلاف امید طوفان کے اثر سے دن میں جہاز وہاں سے گذرا۔ ۹ بجے شب کو پہنچا، کپتان نے مطلع کیا تو فاتحہ پڑھ کر دعائے خیر کی، جب تک فاتحہ پڑھ لی، دل کا تعلق و شوق زیارت قائم رہا، درود شریف کثیر تعداد میں پہلے سے پڑھ لی تھی، اس کا ثواب بھی بخشا، دلی جوش کے ساتھ جو ایک ربط روحانی کی خبر دیتا تھا۔

۱۰؍ ربیع الاول روز شنبہ دن کو دس بجے بمبئی میں جہاز سے مع الخیر اترے، اترنے سے قبل برخوردار

عزیز عبیدالرحمٰن خاں سلمہ کے دیدار سے مسرت حاصل ہوئی، عزیز موصوف ازراہ سعادت مندی بیتاب ہوکر قدموں پر گرے، میں نے روکا کہ یہ مت کرو، جہاز کے کنارہ سے نیچے نظر کی تو دو محبوب چہرے اور نظر آئے، مولوی سید مناظر احسن صاحب اور مولوی عبدالباری صاحب ندوی، عزیزی مولوی عبدالحمید خاں بھی پہنچ گئے تھے، بمبئی میں ورود ایسے مبارک وقت میں ہوا کہ شہر مجالس میلاد مبارک کی برکت سے منور تھا، کئی مجلسوں میں شرکت کا شرف حاصل ہوا، جامع مسجد کی بالائی منزل کی روشنی ایسی دلفریب تھی کہ نگاہ ہٹتی نہ تھی، تعجب خیز مجلس الفضل کے یہاں کی تھی، پورے نجدی خیال کے آدمی ہیں، مگر اس سال مجلس مبارک کی اور اس اہتمام سے کہ تجدید و قیام و سلام، نعت خوانی، ذکر شریف، ضیافت سب ہی لوازم مجلس ادا ہوئے، جزاہ اللہ تعالیٰ خیراً۔ بمبئی سے روانہ ہوکر میں تو مع نفیس دولہن وغیرہ حیدرآباد ۱۳؍ ربیع الاول کو پہنچا۔ تاکہ اول شاہ اسلام اعلیٰحضرت خلد اللہ ملکہ کے سلام کی عزت حاصل کروں، باقی قافلہ علی گڑھ روانہ ہوا، بعونہ تعالیٰ تمام قافلہ زندہ و سلامت سفر سے واپس ہوکر فائز وطن ہوا، اور گھر پہنچنے پر بھی کسی نے کوئی خبر بد نہ سنی، حیدرآباد میں تھوڑا سا قیام کرکے بعد اجازت خسروی میں بھی ۱؍ ربیع الاول روز شنبہ کو بوقت عشا بخیریت حبیب گنج پہنچ گیا، اول مسجد سے ملاقات کی، دوگانہ نفل ادا کیا، اس کے بعد اعزا کے دیدار سے مسرور ہوا، فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔

یاد آیا حیدرآباد پہنچنے کے دوسرے روز یہ خوش خبری حبیب گنج سے پہنچی تھی کہ نور چشمی کلاں کے یہاں دختر نیک اختر تولد ہوئی، حمیدہ خاتون نام ہے، سلمہا اللہ تعالیٰ۔ حبیب گنج میں اطلاع ہوئی کہ اعلیٰ حضرت نظام نے براہ کرم خسروانہ من ابتداء یکم ربیع الآخر میری ملازمت میں ایک سال کی توسیع منظور فرمائی۔

حبیب گنج سے روانگی ۱؍ شوال المکرم روز شنبہ کو ہوئی تھی، واپسی ۱؍ ربیع الاول روز شنبہ ہوئی، جملہ ایام سفر مبارک پانچ مہینے ۔

شکر کہ جمازہ بمنزل رسید   زورق امید بساحل رسید

(باقی)

شمالی ہند کے چند علمی و ادبی مراکز

ضلع بریلی (۲)

جناب ڈاکٹر محمد ولی الحق صاحب انصاری لکچرر لکھنؤ یونیورسٹی

(۶)

شمالی ہند کے دوسرے ادبی مرکزوں کی طرح بریلی میں بھی اردو زبان اٹھارہویں صدی عیسوی میں مقبول ہو چکی تھی، اور روزمرہ بول چال میں فارسی کی جگہ لے چکی تھی، اس زمانہ میں عہد محمد شاہی کے صوبیدار بریلی نواب ہدایت علی خاں خود شعر کہتے تھے، اور قدرت اللہ شوق نے ان کے اردو کلام کا نمونہ طبقات الشعرا میں پیش کیا ہے، اس میں سے ایک شعر درج ذیل ہے،

ہاتھ سے دلبر کے سرگرداں ہر تو — بے طرح پھیرا ہے تجھکو کو بکو

حافظ رحمت خاں (متوفی ۱۷۷۴ء) کے عہد میں ہمیں بریلی میں چند ایسے شاعروں کا پتہ چلتا ہے جو فارسی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی شعر کہتے تھے اور اس فن میں شعرائے دہلی کے مقلد تھے، چنانچہ کندن سنگھ فارغ شاہ حاتم کے بریلوی شاگرد تھے، اگرچہ سعادت خاں ناصر نے انھیں قائم کا شاگرد لکھا ہے، سرور ان کے کلام کے مداح ہیں، اور انھوں نے ان کے درج ذیل اشعار بطور نمونہ کلام پیش کیے ہیں،[۱]

ابروئے یار یہ کس پر ہے چڑھائی تیری — قتل کو بس ہے مرے چشم نمائی تیری

[۱] عمدہ منتخبہ، ص ۴۴۹ - خوش معرکۂ زیبا (مخطوطہ لکھنؤ یونیورسٹی) ورق ۳ (الف)

دور سے دیکھ مجھے چھپ بچھیں ہو جانا — تاکہ کچھ کہہ نہ سکوں بل بے رکھائی تیری

پاے پٹ جو زلف کی تیرے چلی چلی — گلشن میں باغ باغ ہوئی ہے کلی کلی

ہم دل جلوں کے باغ میں گر آئے شمع بھی — دیکھ آہ شعلہ بار پکارے جلی جلی

دم غنیمت ہو جو بچ جائے یہ جان آج کی رات — شمع ساں سر پہ ہمارے ہے گراں آج کی رات

ہو سکے دیوانگی میں کون ہمسر ہم سے آج — پھر سے آباد ان ہوا زنجیر کا گھر ہم سے آج

بہادر سنگھ بہادر بھی اسی دور کے ایک اور شاہ حاتم کے شاگرد تھے، جو اگرچہ دہلی کے رہنے والے تھے لیکن بریلی میں آباد ہو گئے تھے، ان کا نمونۂ کلام درج ذیل ہے،[۱]

ملا ولا نظر آتا ہے کچھ گل رخسار — دبا ہے کس کے گلے کا تو ہار ساری رات

ادھر تو مسکی ہے چولی اُدھر ہیں ٹوٹے بند — نہ جانے کس نے یہ لوٹی بہار ساری رات

وا دریغا ہزار و ا ویلا — حال سے میرے ایسی بے خبری[۲]

راجہ نہلاس رائے مہراج قوم کے کائستھ اور حافظ الملک کے دیوان تھے، بریلی کے رؤسا میں شمار کیے جاتے تھے، حکیم قدرت اللہ قاسم ان کی جوانمردی، مروت، نیک نہادی کے بڑے مداح ہیں، لکھتے ہیں کہ "بہ ہر کس و ناکس بہ مردمی و فتوح می ساخت و با ہر عامی و اہل ہنر محبت و اخلاص می باخت با اہل فضل و کمال بکمال عجز و انکسار ملاقات می نمود و با صاحبان علم و دانش بہ نہایت مسکنت و غربت اختلاط می فرمود"۔ قاسم اور سرور دونوں ان کے صاحب دیوان ہونے کی شہادت دیتے ہیں،[۳] ان کے چند اشعار نمونتاً درج ذیل ہیں:۔

آرام کا ہو کونسا اسباب فلک پر — عیسیٰ کو بھی ملے نہ کبھی خواب فلک پر

[۱] عمدہ منتخبہ، ص ۱۳۵ - مجموعہ نغز، ص ۱۱۱ [۲] یہ شعر مجموعہ نغز میں راجہ رام پنڈت بزاز، راجہ دیارام بہادر کے نام سے منسوب ہے [۳] مجموعہ نغز، حصہ دوم، ص ۲۲۹ - عمدہ منتخبہ، ص ۳۷، (مجموعہ نغز میں ان کا نام نہلاس رائے دیا ہے جبکہ عمدہ منتخبہ میں یہ نام ہلاس رائے لکھا ہے)

دیکھا ہے کہیں اس نے ترے حسن کا جلوہ
آئینۂ خورشید ہے بے آب فلک پر

مکھڑے کو جو دیکھا ہر کبھو رات کو تیرے
رہتا ہے کھلا دیدۂ مہتاب فلک پر

اسی عہد کے ایک اور شاعر احمد خاں احمد کا ذکر فارسی گو شعراء کے ساتھ کیا جا چکا ہے، ملا سری رام کے بقول وہ کبھی کبھی اردو میں بھی شعر کہہ لیا کرتے تھے،[1] ان کے اردو کلام کے چند شعر درج ہیں،

کیوں نہ ہووے دل مرا نخچیر زلف
عاشقوں کی قید ہے زنجیر زلف

مار ڈالے چاہنے والوں کو وہ
دیکھی ہم نے کچھ عجب تاثیر زلف

مصحف خوبی کا کرتی ہے بیاں
حسن معنی کی لکھے تفسیر زلف

دشت مجنوں کا مجھے احمد ہے شوق
دل پہ میرے ہے گر تاثیر زلف

اسی زمانے میں بریلی میں ایک اور شاعر احمد خاں کا ذکر شوق نے کیا ہے، وہ انھیں بھی حافظ رحمت خاں کا مقرب بتاتے ہیں، ان کے بیان کے مطابق طبقات الشعراء کی ترتیب سے کچھ پہلے ان کا لکھنؤ میں انتقال ہوا،

نعیم اللہ خاں نعیم جن کا ذکر سرور اور مصحفی نے کیا ہے، اسی عہد کے ایک اور شاعر ہیں جن کا بریلی ضلع سے تعلق تھا، بقول سرور وہ شاہ جہاں آباد کے باشندے اور شاہ حاتم کے کہنہ مشق شاگرد تھے، مصحفی کا بیان ہے کہ وہ اپنی پُرگوئی کے لیے مشہور تھے، اور ایک ضخیم دیوان کے مصنف تھے، مصحفی سے ان کی پہلی ملاقات آنولہ میں ہوئی تھی، اور ان کے بعد محمد یار خاں کے دربار میں دونوں کا ساتھ رہا، لیکن ضابطہ خاں کی شکست کے بعد جب روہیلوں میں انتشار پیدا ہوا تو وہ بھی محمد یار خاں کے دربار سے ہٹ کر بریلی چلے آئے،[2] ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

[1] خمخانۂ جاوید، جلد اول، ص ۱۸۶ [2] تذکرہ ہندی ص ۲۵۹ - عمدۂ منتخبہ، ص ۷۷ - خوش معرکہ زیبا، ورق ۱۲ (ب) (اس تذکرہ میں نعیم کو بھی شاہ حاتم کے بجائے قائم کا شاگرد بتایا گیا ہے) طبقات الشعراء (مخطوطہ دار المصنفین اعظم گڈھ)

آفت کی نشانی ہی رہی ہم تو زمیں پر
جو سنگ بلا چرخ سے آیا سو ہمیں پر

یار تو کل ہم سے ملا تھا نعیم
لیک حجاب آہ دغا کر گیا

کچھ تو ادھر شرم سے بولا نہ یار
کچھ میں ادھر آپ حیا کر گیا

بدھ سنگھ قلندر قوم کے کھتری دہلی کے باشندے تھے، خوشحال خاندان سے تعلق رکھتے تھے، لیکن تقریباً دو لاکھ روپیہ کی نقد و جنس لٹا کر نانک پنتھی فقیر ہو گئے تھے، موت سے کچھ سال قبل بریلی میں آکر متوطن ہوئے، لیکن درویشانہ زندگی نہ چھوڑی، عالم نزع میں وصیت کی کہ ان کا پلنگ کسی سنسان وادی میں ڈلوا دیا جائے تاکہ آخری رسوم کے لیے لیجانے کی تکلیف نہ کرنا پڑے، ان کے انتقال کے بعد ان کے اشعار کے مسودے مولاس رائے رنگین نے جمع کیے تھے، اور قدرت اللہ شوق کی نظر سے اُن کا دیوان گزرا تھا،[1]

زہراب تیغ ناز و ادا کا جو پی گیا
کہنے کو مر گیا پہ جو پوچھو تو جی گیا

مست ہی رہتے ہیں دن کیا رات کیا
ہم قلندر ہیں ہماری بات کیا

قلندر تو کیا دل کی پوچھے ہے باتیں
تجھے دل کا رونا مجھے اپنے جی کا

طالب نہیں ہوں دین کا نہ دنیا پرست ہوں
عاشق ہوں دردکش ہوں قلندر ہوں مست ہوں

جدائی میں تری اے یار جانی
ہوئی ہے موت ہم کو زندگانی

فیض اللہ بیگ فدوی لاہوری بزعم خود اساتذہ میں تھے، اور سودا سے چشمک کی وجہ سے کافی شہرت کے مالک تھے، یہ بھی اپنی زندگی کے آخری زمانہ میں بریلی میں تھے اور یہیں ان کا انتقال ہوا، شوق سے ان کی آنولہ میں ملاقاتیں بھی ہوئیں، یوسف زلیخا کا قصہ انھوں نے اردو میں نظم کیا تھا، فدوی کا ایک شعر بطور نمونہ کلام پیش ہے:[2]

[1] طبقات الشعراء (مخطوطہ دار المصنفین اعظم گڈھ) [2] ایضاً

پہلو میں اپنے وردِ اشغال کے متصل | بیٹھا قریب ساتھ جو دہ ملی کے متصل

خواجہ حسن المتخلص بہ حسن خلف خواجہ ابراہیم اسی عہد کے ایک اور شاعر تھے، جن کا بریلی سے تعلق تھا، سرور ان کے بیحد مداح ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں کہ

"صوفی مشرب، عالم باعمل و فاضل اکمل کہ بہ تقدس ذات و پاکیزگی صفات مقتدا و پیشوائے عصر خود است و تشنہ لبان وادی حقیقت را بہ زلال مصفائے ہدایت سیراب و شاداب می فرماید و اوقات شریف خود را با وصف تعلقات دنیوی بیاد و ذکر مجاہدات الٰہی مصروف می دارد در علم محمد سیقی ہم یکتا و یگانہ و مستثنیٰ است بلکہ در این زمان بے عدیل و انباز...... فضل و کمالش حد اتم خیت کہ حرفے از آں نگارد۔"

مرزا علی لطف کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ شاہجہان آباد وطن تھا، لیکن مصحفی کا قول ہے کہ فیض آباد اور لکھنؤ آنے سے قبل بریلی میں ان کا قیام رہتا تھا، لکھنؤ آنے کے بعد وہ رستم نگر میں مقیم ہوئے اور بقول لطف توسل امور دنیا انھیں سرفراز الدولہ مرزا حسن رضا خاں سے حاصل تھا، اور وہ درویشی اور فقیری میں آدھا لکھنؤ ان کا معتقد تھا، فن شعر میں جعفر علی حسرت سے مشورہ کرتے تھے، اس فن کے علاوہ دوسرے فنون میں بھی ان کو دخل تھا، چنانچہ میر حسن انھیں فن طلسم و شعبدہ بازی کا ماہر اور لطف علم نجوم سے واقف بتاتے ہیں، ان علوم میں بھی ان کی متعدد تصانیف تھیں، حسن اردو کے صاحب دیوان شاعر تھے[1]، ان کے کلام کا نمونہ درج ذیل ہے۔

جو بندہ خانہ میں آئے گا فقیر تم کو دعا کریگا | کسی کے دل کو جو خوش کروگے خدا تمھارا بھلا کریگا

بھلا میں دیوانا سہی پر یہ ناصح | مرے ساتھ بکتا ہے عاقل کو دیکھو!

یہاں تھک کے بیٹھے ہو کیا راہ میں تم | چلو راہ رو اپنی منزل کرو دیکھو

[1] تذکرۂ ہندی ص ۷۱، عمدۂ منتخبہ ص ۲۱۹ ـ تذکرۂ میر حسن ص ۴۹ ـ طبقات الشعراء ـ گلشن بے خار ص ۵۹ ـ گلشن ہند (طبع لاہور) ص ۸۹ ـ قاموس المشاہیر ج اول ص ۲۰۲

کون سا نقصان اس میں آپ کا ہو جائیگا | اس طرف ٹک مڑ کے دیکھو گے تو کیا ہو جائیگا

وہ تو آئے تھے تماشے کو مرے نزع کے پر | ہم نے اس وقت میں بھی ان کا تماشا دیکھا

جوں شمع اشک و آہ سراپا بنا دیا | اے عشق مجھکو زور تماشا دکھا دیا

وقت وداع یار دل بیقرار نے | وہ آہ کی کہ عرش معلی ہلا دیا

جوں نقش پا گلی میں ہوں اس کے پائمال | میری ہوا نے خاک میں مجھکو ملا دیا

عہد حافظ رحمت خاں کے ایک اور شاعر جن کا بریلی سے تعلق ہے، میر عوض علی رعا ہیں جو حقیقتاً شاہجہان آباد کے رہنے والے اور طبیب حاذق تھے، اپنے پیشہ ہی کے سلسلہ میں حافظ رحمت خاں کے بیٹے عنایت خاں کے دربار سے وابستہ تھے، میر حسن ان کے بہت مداح ہیں، انھیں "شاعر بے نظیر منشی خوش تقریر، مخزن اشعار غرا، معدن انشاء و املا" کے القاب سے یاد کیا ہے، اور ان کے ایک قصیدہ کے مندرجہ ذیل اشعار بطور نمونہ پیش کیے ہیں[1]،

پھر ہے بادل شدگان در پے آزار فلک | متصل چھڑکے ہے ناسور پہ سینہ کے نمک

نشہ عیش سے ہر سرو دیا تنک سرشار | کر لیا جا ہے ہر غنچہ کے تنکداں سے گزک

حسن کے خلوتیاں بزم حنا بندی میں | شعلے سے باندھے ہیں پروانے کے پاؤں پہ کنک

محفل عیش میں بلبل نے بجائی شہنا | گوشۂ باغ میں غنچہ نے اٹھائی ڈھولک

نواب محبت خاں محبت کا ذکر فارسی گو شعراء کے سلسلہ میں ہو چکا ہے، اردو میں وہ جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے، اور تمام اصناف میں طبع آزمائی کرتے تھے، ممتاز الدولہ مسٹر جانسن کی خواہش کے مطابق انھوں نے سسی پنوں کے قصہ کو نظم کیا، اور اس مثنوی کا نام اسرار محبت رکھا، ان کے کلام کے سلسلے میں سعادت خاں ناصر نے ایک دلچسپ قصہ لکھا ہے، کہ قلندر بخش جرأت نواب محبت خاں

[1] تذکرہ شعرائے اردو (میر حسن) ص ۱۰۳

کے دربار میں ملازم تھے، ایک مرتبہ لوگوں نے ان سے پوچھا کہ آپ نئی غزلیں کیوں نہیں کہتے، جواب دیا جو غزلیں نئی کہتا ہوں وہ نواب صاحب کے دیوان میں چلی جاتی ہیں، مگر راقم الحروف کے خیال میں اس قصہ میں کچھ حقیقت نہیں ہے، نواب محبت خاں کے کلام کو جرأت کا کلام بتانا سراسر زیادتی ہے، اس لیے کہ محبت کا کلام صرف اردو ہی میں نہیں ہے بلکہ فارسی اور پشتو میں بھی ہے، اور کسی بھی دوسرے تذکرہ نگار نے ان کے کلام کو دوسروں کا کلام نہیں قرار دیا ہے[۱]۔ ان کے اردو کے چند اشعار یہ ہیں:

ہوتا ہے ابھی حاصل سب کام محبت کا
دے اس کو خداوندا تو جام محبت کا

الفت میں جس کو اشک بہانے کی خو نہ ہو
اس کو خدا کرے کہ کہیں آبرو نہ ہو

آپ کچھ غیروں کو چھپ چھپ کے رقم کرتے ہیں
یہ جو ہر جھوٹ تو ہم ہاتھ قلم کرتے ہیں

منظور تجھ کو شوق ہو گر لالہ زار کا
تختہ الٹ کے دیکھ ہمارے مزار کا

حسن کو تیری آنکھوں سے سروکار رہے گا
بالفرض جیا بھی تو وہ بیمار رہے گا

رکھتا ہے حلاوت تو لب یار کا بوسہ
پر ہے نمکین زور ہی رخسار کا بوسہ

آکے دیکھ چلے سب اشارے ہم تو
مر گئے ہائے اسی رشک کے مارے ہم تو

محبت خاں کے بریلی سے جلاوطنی کے بعد اسی واقعہ سے متعلق چند اشعار بھی سنیے۔

پہنچ گئے سبھی تجھ تک کسی قرینہ سے
یہ ہم ہی رہ گئے سر کو پٹکتے زینہ سے

وطن کو چھوڑ کے جاتے ہیں اس طرح مجبور
چلے تھے اہل حرم جس طرح مدینہ سے

پلک کے مارتے دم میں ابھی اٹھے طوفاں
جو اشک جاری ہو ٹک چشم کے سفینہ سے

قضا و قدر محبت یہی تھا جو کچھ کہ ہوا
دگرنہ کچھ نہیں ہوتا کسی کے کینہ سے

نہ قافلہ نہ رہبر کوئی نہ رہ معلوم
گئے کدھر وہ مجھے چھوڑ ہمرہاں افسوس

۱؎ عمدہ منتخبہ ص ۶۶۵۔ مجموعہ نغز حصہ دوم ص ۱۴۰۔ گلشن ہند (مطبوعہ لاہور) ص ۱۶۶، گلزار ابراہیم و گلشن ہند ص ۲۲۹ تذکرہ میر حسن ص ۱۴۴، سخن شعرا ص ۴۱۶، گلشن بے خار ص ۱۷۱۔ خوش معرکۂ زیبا ورق ۹۴ (ب)

دید زمانہ کرتے ہیں ہم چشم خانہ میں
اڑتا ہے اپنا مرغ نگہ آشیانہ میں

دل خشک ہو کہاں سے بہیں اشک چشم سے
فوارہ تب چھٹے جو ہو باقی خزانہ میں

محبت خاں کے بھائی صاحبزادہ محمد اکبر خاں بھی شاعر تھے، امیر مینائی نے ان کے اشعار کا جو انتخاب کیا ہے اس میں سے دو شعر درج ذیل ہیں[۱]:

ہم مر گئے اور اس نے نہ جانا کہ مر گئے
ہر زخم پر جو ملتے تھے لب آفریں کے ساتھ

طوفان نوح و گریۂ اکبر میں فرق ہے
یعنی کہ آسماں کو ڈبویا زمیں کے ساتھ

محبت خاں کے ایک دوسرے بھائی غلام مصطفےٰ خاں کو بھی ان کے بھائی مستجاب خاں نے صاحب دیوان شاعر لکھا ہے، ان کے بقول وہ فارسی میں مختلف تصانیف کے علاوہ اردو میں بھی ایک دیوان اور ایک دوسری کتاب جام حق کے مصنف تھے، اردو میں مست تخلص کرتے تھے، ان کا انتقال بعارضۂ سل و دق تیس سال کی عمر میں، ۲۰ ذیقعدہ ۱۲۰۳ھ مطابق ۱۷۸۹ء میں بریلی میں ہوا، اور وصیت کے بموجب اپنے والد کے مقبرہ کی دیوار کے متصل دفن ہوئے[۲]،

مست کا نمونۂ کلام درج ذیل اشعار ہیں

میں تجھکو چاہتا ہوں تو مجھکو بھی چاہ یار
میں تو نباہتا ہوں تو تو بھی نباہ یار

نہ ہر دم گالیاں دے مست کو تو
زباں [illegible] رکھتا ہے یہ بھی کچھ کہے گا

وضو سے کیا تو اپنا جسم ظاہر پاک کرتا ہے
کدورت دل کی دھو جو مست باطن کی صفائی ہو

اسی زمانہ کے ایک اور شاعر عظیم تخلص آنولہ کے باشندے اور سپاہی پیشہ تھے[۳]، سرور نے ان کے درج ذیل اشعار نمونۃً پیش کیے ہیں،

کارواں اشک کا ہوتا ہے رواں آنکھوں سے
تم کو بھی آہ و فغاں ہم یہ خبر کرتے ہیں

۱؎ انتخاب یادگار ص ۲۹، تذکرہ شعرائے رامپور ۔ ۲؎ گلستان رحمت ورق ۱۸۸ (ب)، اخبار حسن (مخطوطات رامپور)، ۳؎ عمدہ منتخبہ ص ۴۳۰

کوئی تم میں سے بھی چلتا ہو تو آجائے شتاب ورنہ اب یار تو کوئی دم میں سفر کرتے ہیں

کچھ نگہ میں نہیں آتا ہے بجز جلوۂ یار جبکہ ہم دل میں عظیم اپنے نظر کرتے ہیں

مرزا مغل جرأت خلف عبدالباقی خاں بھی اٹھارہویں صدی کے آخری عہد کے شاعر ہیں، مرزا سودا کے شاگرد تھے، بریلی میں وفات پائی[1]، نمونۃً درج ذیل شعر پیش ہے۔

کیوں نہ ہو دین جاں و دل سے ہم نثار آئینہ عکس ہے کھڑے کا تیرے ہمکنار آئینہ

میر غلام علی عشرت بھی اسی دور کے شاعر ہیں، ان کا شمار بریلی کے اساتذہ میں ہے، مرزا علی لطف (شاگرد سودا) سے مشورۂ سخن کرتے تھے، اور ناسخ کے بقول انھوں نے ۱۲۱۱ھ میں ایک مثنوی پدماوت تصنیف کی تھی، صاحب دیوان شاعر تھے، اور بقول مصحفی "دیوانہائے و مثنویہائے متعدد" رکھتے تھے[2]، عشرت کے چند شعر نمونۃً درج ذیل ہیں:

در نایاب تھا ہر چند کہ ڈھونڈھا نہ ملا اشک جو میرا گرا دیدۂ تر سے باہر

کیے ہیں سجدے ترے در پہ یاں تلک ہم نے کہ داغ مٹنے قیامت تلک جبیں کے نہیں

رکھیں گے بعد مرگ اگر خاک کے تلے ساقی تو مجھکو رکھیو کسی تاک کے تلے

یہ رب کعبہ بھلا جھوٹ کیوں کہیں عشرت بتوں کے گھر میں تو ہم نے خدائیاں دیکھیں

چہرہ، دہن و دنداں کرتے یہ اشارے ہیں خورشید میں ذرہ ہر ذرے میں ستارے ہیں

غنچہ کہاں، دہن وہ کہاں وہ سخن کہاں پھولے ہزار پھول ڈلے وہ پھبن کہاں[3]

شب وصال میں دل پر قلق ابھی سے ہے سحر ہے دور مرا رنگ فق ابھی سے ہے

ہنوز دفن ہوا بھی نہیں ترا بسمل کہ زلزلہ میں زمیں کا طبق ابھی سے ہے

---

[1] مجموعۂ نغز، ص ۲۶۹، طبقات الشعراء، سخن شعرا، ص ۱۰۱ [2] عمدہ منتخبہ، ص ۳۴۴، سخن شعرا، ص ۳۰۳، ریاض الفصحا، ص ۲۲۸

تذکرہ شعرائے رامپور، خوش معرکۂ زیبا، ورق ۲۴ (الف) طبقات الشعراء [3] اسی سے ملتا جلتا بیخود موہانی کا شعر بھی پیش ہے

جنت کہاں بہار و یاریاں کہاں تو بہ کرو زمیں کہاں آسماں کہاں

غیروں سے ہنسا وہ جو مرے سامنے عشرت کچھ بس نہ چلا دیکھ کے آنسو نکل آئے

اسی عہد کے ایک اور شاعر جن کا سرور اور قدرت اللہ صدیقی نے ذکر کیا ہے، شاہ غلام محی الدین اویسی ہیں، جو سرہند کے پیرزادے اور بریلی میں متوطن تھے، ان کا مفصل ذکر فارسی شعراء کے ضمن میں ہو چکا ہے، ان کے اردو کلام کا نمونہ یہ ہے:

لائق نہ رہے ہم تو کہیں سیر و سفر کے جیوں نقش قدم جا کہ نشیں ہیں ترے در کے

باغ میں گل عذار ہو نہ فصل بہار ہو نہ ہو میں ہوں غزل سرا وہاں بلبل زار ہو نہ ہو

رکھے ہے گلستان کو جوں باد سحر تازہ ہے آہ سے اب میری ہر زخم جگر تازہ

مشہور چمن میں تیری گل پیرہنی ہے قربان ترے ہر عضو پہ نازک بدنی ہے

اسی زمانہ کے ایک اور شاعر سید پایندہ مسافر ہیں، جن کا ذکر فارسی گو شعراء کے سلسلہ میں ہو چکا ہے، ان کے چند اردو شعر پیش ہیں:

جو اٹھا وے چشم دل سے پردۂ پندار کو بے تامل ہر مکاں میں دیکھ لے وہ یار کو

دیکھ کر بے ثباتی عالم گاہ ہنستے ہیں گاہ روتے ہیں

عمر غفلت میں مفت کھوتے ہیں دن کو پھرتے ہیں رات سوتے ہیں

بخت مل تمکین بھی اسی زمانے کے شاعر ہیں، جو کشمیری الاصل تھے، اور شاہجہان آباد میں پیدا ہوئے تھے، لیکن بریلی میں سکونت اختیار کر لی تھی[1]، سرور نے ان کے درج ذیل اشعار بطور نمونۂ کلام دیے ہیں:

قید سے ہو تیرے ظالم جو رہائی مجھکو پھر نہ دوں دل تجھے ہے تیری دہائی مجھکو

بن گیا آئینہ ساں صاف سراپا حیرت تیرے چہرے کی جو یاد آئی صفائی مجھکو

آج سر پنجۂ مژگاں جو بہ خوں رنگیں ہے کس کا یاد آیا ہے یہ دست حنائی مجھکو

---

[1] عمدہ منتخبہ، ص ۱۷۰۔ بہار گلشن کشمیر

فصل گل جاتی ہے اور کنج قفس سے تمکین
داد و بیدا نہیں سوجھے ہے رہائی مجھکو

دیوالی سنگھ جوہر، قوم کے کھتری اور بریلی کے باشندے تھے، سرور نے ان کا ذکر کیا ہے، لیکن حالات نہیں لکھے ہیں، لالہ سری رام نے بھی اسی عہد کے ایک شاعر جوہر بریلوی کا ذکر کیا ہے لیکن حالات ان کو بھی نہ معلوم ہو سکے، غالباً لالہ سری رام کے متذکرہ جوہر یہی دیوالی سنگھ جوہر تھے[1]، جوہر کے تین شعر سرور، اور سری رام نے لکھے ہیں:

تجھ بن ہے خراب زندگانی
دل پر ہے عذاب زندگانی

ہے دست شانہ زلف بت خود پسند پر
یا یہ چڑھا ہے چور لپٹ کر کمند پر

سوار نقرے کے دریا سے کون گزرا ہے
ہلال پکڑے ہے جس کی رکاب درتہ آب

کلو خاں ہنر پسر فدائی خاں، قوم افغان، متوطن آنولہ، فیض اللہ فدوی کے شاگرد تھے[2]، ان کے چند شعر یہ ہیں:

صورت سے اگر جبیں بہ جبیں کیجیے گا
باز آنے کا نہیں دل یہ یقیں کیجیے گا

دعویٰ نہ کیجیو دہن تنگ یار سے
یہ بات غنچہ رکھیو تو اپنے دہن کے بیچ

جبکہ دل کو تری زلفوں سی بتر کار نہ تھا
اس قدر دام بلا میں یہ گرفتار نہ تھا

میر عزت اللہ جذب (ان کا نام سرور نے سید بھکاری لکھا ہے) بھی اسی دور کے بریلوی شاعر تھے، سرور ان کو ماہر شاعر کہتے ہیں، اور ان کے کلام کو دلکش بتاتے ہیں، شیفتہ اور لالہ سری رام کے بیانوں سے پتہ چلتا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم تھے، اور جاسوسی کے سلسلہ میں سیر و سیاحت میں مشغول رہتے تھے، یہاں تک کہ نواح بخارا میں قتل کر دیے گئے[3]، ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

---

[1] عمدہ منتخبہ ص ۱۸۹، خمخانۂ جاوید جلد دوم ص ۲۹۷ [2] طبقات الشعرا، (مخطوطہ دار المصنفین اعظم گڈھ) [3] عمدہ منتخبہ ص ۱۵۰، گلشن بیخار ص ۳۸، خمخانۂ جاوید جلد دوم

واں صفائی ہے خود نمائی ہے
یاں مری جان کی صفائی ہے

اے فلک مجھ سے اتنی بے رحمی
یہ ترے دل میں کیا سمائی ہے

یاں ہوئے ہم تو جاں بحق تسلیم
واں ابھی عشق آزمائی ہے

ہوں مسلمان بندۂ کافر
کچھ عجب طرح کی خدائی ہے

جذب چل دیکھ آستانۂ یار
ہم ہیں اور واں کی جبہ سائی ہے

سید شاہ حسین حقیقت، ان کے اجداد بلخ کے رہنے والے تھے لیکن حقیقت خود سرکار بریلی میں پیدا ہوئے اور فکر معاش میں لکھنؤ پہنچے، قلندر بخش جرأت سے مشورۂ سخن کرتے تھے، اور معلمی پیشہ تھا، سرور نے ان کے کلام کو دلکش لکھا ہے، نثر میں تذکرۂ احباب کے مصنف ہیں، جس کی مصحفی نے مذمت کی ہے[1]، ان کے چند اشعار پیش ہیں:

کیا ترے عشق میں لے عربدہ جو ہاتھ لگا
زیست سے ہاتھ بھی دھویا پہ نہ تو ہاتھ لگا

ساقیا پیوے جو زاہد مے ناب کے گھونٹ
بسر پیر مغاں اس کا گلا دابکے گھونٹ

ہجر میں کیوں نہ کروں یاد ملاقات اسکی
کہ بہلتا ہے ذرا وصل کی تقریب سے دل

برنگ موج دریا اضطراب دل کے ہاتھ اب
چلے جاتے ہیں کیا جانے کدھر ہم بیقراری میں

فروغ شاہ فارغ، ان کا وطن بریلی لیکن مسکن شکارپور تھا، آزاد طبع درویش تھے، سرور نے ان کا صرف ایک شعر بطور نمونۂ کلام پیش کیا ہے[2]:

دیوار و در پہ جلوۂ ذرات ایک ہے
شان و صفت جدا ہوں ولے ذات ایک ہے

نظیر الدین شائق بریلی کے باشندے اور سرہند کے پیرزادے تھے، سرور اور سری رام دونوں نے

---

[1] عمدہ منتخبہ ص ۲۳۷، مجموعہ نغز حصہ اول ص ۲۱۵، تذکرۂ ہندی، گلشن بیخار ص ۶۱، خوش معرکۂ زیبا ورق ۱۵۰ (ب) [2] عمدہ منتخبہ، ص ۴۸۶

ان کا صرف مندرجہ ذیل ایک شعر نقل کیا ہے:[1]

اگر اس طرح سے ہمیشہ کو مری چشم غم سے تری رہی
تو مزارعوں کو یہ مژدہ دو کہ تمھاری کھیتی ہری رہی

شائق تخلص ایک دوسرے شاعر بھی بریلی میں اسی زمانہ میں گزرے ہیں، یہ محمد نذیر الدین حسن ابن شاہ غلام محی الدین اویسی ہیں، جن کا ذکر بحیثیت مصنف عطر بہار فارسی نثر نگاروں میں ہو چکا ہے یہ بھی سرہند کے پیرزادوں میں تھے اور بریلی میں آباد ہو گئے تھے،[2] ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے

ڈرتا نہیں وہ ظالم خونخوار کسی سے
بھڑ جائیگا اب کھینچ کے تلوار کسی سے

یہ جو سب گل عذار بیٹھے ہیں
باغ دل کی بہار بیٹھے ہیں

چین اس دل کو نہ اک آن ترے بن آیا
دن گیا رات گئی رات گئی دن آیا

گلشن میں اگر ناز سے ہووے وہ خراماں
غنچے بھی کریں اپنے گریبان کے ٹکڑے

نہ ہو اس حسن پر مغرور اے گل
یہ سن لے ہر کمالے را زوالے

اگر شائق تو چاہے لذت عشق
بتوں سے بھاگ اور راہ خدا لے

میر سعادت علی خلف میر غلام علی عشرت، ان کا تخلص سرور نے سعادت اور میر مینائی نے عیش لکھا ہے، بریلی کے باشندے تھے، لیکن نواب احمد علی خاں کے دربار سے ملازمت کی وجہ سے رامپور میں رہا کرتے تھے،[3] ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

خاک چمن ہو موسم گل میں یہ عشق خیز
لالہ زمیں سے اگتا ہے سینہ پہ کھائے گل

اب دام سو سمجھتا ہے نہ صیاد پر نگاہ
اللہ رے عندلیب کا شوق لقائے گل

چہرے سے اسکے پردہ جو اٹھا نقاب کا
بس دودھیں رنگ زرد ہوا آفتاب کا

جسے کہتے ہیں مشک چھپ وہ نقب ہے زلف عنبریں کا
جو تم ہو چرخ چارمیں کا وہ ایک ذرہ ہے اس جبیں کا

---

[1] عمدۂ منتخبہ ص ۴۷۳، خمخانۂ جاوید جلد ۴ ص ۵۱۵ سم سنہ عمدۂ منتخبہ ص ۴۹۶، عطر بہار (مخطوطہ رامپور) طبقات الشعراء (مخطوطہ دار المصنفین اعظم گڈھ)
[3] عمدۂ منتخبہ ص ۴۴۳، انتخاب یادگار ص ۳۳۹

طالب جنت نہیں ہیں ساکنان کوئے دوست
عرش پر رکھتے ہیں سر افتادگان کوئے دوست

قدرت اللہ شوق کا ذکر فارسی اہل قلم کے سلسلہ میں ہو چکا ہے، اردو شاعری میں بھی ان کا بلند مقام ہے، وہ قائم چاندپوری سے مشورۂ سخن کرتے تھے،[1] نمونۂ ان کے چند شعر پیش ہیں:

دل و دیں صبر و قرار و خرد و تاب و تواں
گھر کا گھر لٹ گیا اور ہم سے بچایا نہ گیا

کیا دل کا فرما مرد دو دیر و کعبہ ہے
نے بتوں سے ربط اس کو نے خدا سے آشنا

در بدر خاک بسر کرتے ہی دیکھا شب و روز
مثل خورشید جو طالب کوئی زر کا نکلا

وسعت دل یہ چاہتی ہے مری
لامکاں پر مکاں بنائیے گا

مغفرت ہاتھ باندھ کر آئی
دیکھ میرے گناہ کی حشمت

کٹی جس طرح عمر حسرت میں سب
تو یہ دن بھی دم میں گذر جائے گا

تو بھی تو آ کے سیر دل داغ داغ کر
روشن کیا ہے گھر ترا لاکھوں چراغ سے

مثل گل گو کہ رکھیے پردوں میں
بوئے الفت چھپی نہیں رہتی

میرے ملنے سیتیں اتنا پرہیز
بل بے غیرت اسے کیا کہتے ہیں

اے شوق تیرے شعر کی اتنو پڑی ہے دھوم
سودا و میر و قائم و درد و آثم تک

گل کترتا ہے ہر اک بات میں تو تو اے شوق
کیا بیاں کیجیے ترے طرز سخن کی خوبی

ہزاروں صورتیں دیکھیں پہ یہ نقشا نرالا ہے
یہ قدرت ہے شاید آپ کو سانچے میں ڈھالا ہے

ہر اک عضو اس کا جو دیکھو تو عالم سے نرالا ہے
غضب جوڑا عجب کنگھا ستم کانوں کا بالا ہے

کہے ہے شوق کے اشعار سن جرأت یہ حسرت سے
عجب انداز ہے کچھ اس کی کیا کہنے ہی والا ہے

غافل تجھے کرتا ہے یہ گھڑیال منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹا دی

---

[1] انتخاب یادگار ص ۱۸۳، گلشن بیخار ص ۱۱۲، تذکرۂ شعرائے رامپور، عمدۂ منتخبہ ص ۱۰۴، خمخانۂ جاوید ج ۵ ص ۸۳

اے خداؤں بھی کبھی تیری خدائی ہوگی کہ مجھے اس کی جدائی سے جدائی ہوگی

قدرت اللہ شوق نے طبقات الشعرا میں مقالۂ چہارم میں اپنے جن عزیزوں اور دوستوں کا ذکر کیا ہے، اُن شعرا میں بریلی کے ایک صاحب ناصر خاں تھے، جنھیں شوق نے "آدم بے مثال" کہا ہے اور غلام جیلانی بیدم کا شاگرد بتایا ہے، انکے جو اشعار پیش کیے ہیں، ان میں سے چند درج ذیل ہیں،[1]

جب غنچہ نمط خوش دل غمناک کرونگا داماں وگریباں کے تئیں چاک کروں گا

بیٹھا ہے مرے دل پہ غبار غم ہجراں فرقت میں تیری کیا میں خوشی خاک کروں گا

اب فیض قدم اپنے سے اے قیس ترے بعد میں خانۂ زنجیر کو معمور کروں گا

ہو جائیں خاک جل کے زمیں آسماں تلک آوے جو دل سے آہ ہماری زباں تلک

محفل ہو تیری اس دلِ سوزاں کی زندگی جیسے بقائے شمع کہ ہو انجمن تلک

شوق نے بریلی کے چند دوسرے نومشق شعرا کا بھی ذکر کیا ہے، ان میں سے ایک حافظ عزت اللہ عباس تھے، جو اگرچہ شعرگوئی کو باعثِ ننگ جانتے تھے، پھر بھی گاہے ماہے شعر کہہ لیا کرتے تھے، ان کا ایک شعر پیش ہے،[2]

تیرے ہی کچھ پڑی نہیں یہ زلف پیش پا اہل زمیں پہ اتری ہے بالا سے یہ بلا

حافظ محمد معتصم عباسی کو بھی شوق نے نومشق شعرا میں شمار کیا ہے اور ان کا صرف ایک شعر نمونۃً نقل کیا تھا،[3]

شیخ عبداللہ نکہت کو بھی شوق نے اسی دور کے نومشق شعرائے بریلی میں شمار کیا ہے اور معین الدین عباس کا شاگرد بتایا ہے۔[4] ان کے دو شعر پیش ہیں۔

ہے زیست عاشقوں کی خوباں کی کج ادا پہ معشوق بھی جہاں میں کرتے ہیں سب خدائی

۱؎ طبقات الشعرا، مخطوطہ دارالمصنفین اعظم گڑھ ۲؎ ایضاً ۳؎ ایضاً

رنگیں کیا ہے کس کے خون جگر میں تم نے پنجہ جو ہو رہا ہے صاحب کا اب حنائی

انیسویں صدی کے اوائل کے شعرا میں میر محمد جان نالاں کا ذکر مصحفی نے کیا ہے، وہ مہدی علی خاں صوبیدار بانس بریلی کے بیٹے اور ابتداءً مصحفی کے ایک شاگرد موجی رام موجی کے شاگرد تھے لیکن بعد کو مصحفی سے اصلاح لینے لگے تھے،[1] ان کے کلام کا نمونہ درج ذیل اشعار ہیں،

وصل کی شب مجھے کیا یار نے سونے نہ دیا دیدۂ طالب دیدار نے سونے نہ دیا

گرچہ افسانے سے نیند آتی ہے مجھکو لیکن قصۂ عشق دلِ زار نے سونے نہ دیا

نہ گیا مرنے پہ بھی درد جو دل کا میرے قبر میں بھی دل بیمار نے سونے نہ دیا

گرچہ ہوں ساکن گلزار ولے نرگس وار یاد دیدارِ گرفتار نے سونے نہ دیا

چشم انجم کی طرح دار ہے مت دیدۂ شوق اک شب آرزوئے یار نے سونے نہ دیا

چھیڑنے کو مجھے تصویر خیالی بھیجی خواب میں بھی مجھے دلدار نے سونے نہ دیا

وہ تو اس بات پہ راضی تھا مگر اے نالاں پاس میرے اسے اغیار نے سونے نہ دیا

کیا نازکی سے رکھے وہ صمصام دوش پر ہو بار جس کو زلف سیہ فام دوش پر

عاشق مزاج کہتے ہیں بچپن سے مجھکو لوگ آتا نہ تھا کبھی مجھے آرام دوش پر

پھرتے ہیں ترے عشق میں لے برہمن پسر زنار رکھ کے صاحب اسلام دوش پر[2]

اسی عہد کے ایک اور شاعر محمد شرف عاصی ہیں جنھیں قدرت اللہ شوق نے آنولہ کا باشندہ بتایا،[3] اور ان ہی کے بقول وہ ایک مختصر دیوان کے مصنف تھے، عاصی کی اکثر غزلیں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی مدح کے اشعار سے شروع ہوتی ہیں، چند اشعار درج ذیل ہیں:

زلف سیہ کے پیچ میں جاتا ہے خود بخود اس دل کو ہائے کچھ نہیں کالی بلا کا خوف

۱؎ ریاض الفصحا، ص ۲۲۱۔ ۳۲۲، خوش معرکۂ زیبا، ورق ۱۴۶ (الف) ۲؎ خمخانۂ جاوید، ج ۲، ص ۵۵ ۳؎ طبقات الشعرا، مخطوطہ دارالمصنفین اعظم گڑھ

تیغ نگاہ ڈوب رہی ہے لہو میں آج
کس خانماں خراب کو تم پار کر چلے

سید عابد حسین راحت بریلوی ۱۸۲۰ء تک زندہ تھے، لیکن حالات کا پتہ نہیں چلتا[۱]، ان کے ایک معاصر بلاس رائے رنگین برادر راجہ بلاس رائے تھے، سعادت خاں ناصر (صاحب خوش معرکۂ زیبا) نے انھیں قدرت اللہ شوق کا شاگرد بتایا ہے، اور خود قدرت اللہ شوق کے قول کے مطابق رنگین صاحب دیوان شاعر تھے[۲]، لیکن شوق ان سے خفا معلوم ہوتے ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں: "بسیار بے فیض و ناقدردان ...... دیوان ریختہ ترتیب دادہ ...... اشعارش خالی از لطف معانی و شاعری است۔" ان کے چند شعر پیش ہیں۔

غیروں کے پاس جا کے ہم سے کبھی نہ ملنا
افسوس ہجر تو یہ ہے ارمان ہجر تو یہ ہے

پہچان لیجو مشہد رنگین سے اے صبا
اٹھتا ہے اس کی خاک سے اب تک غبار سرخ

اسی زمانہ میں بریلی میں ایک اور شاعر باقر علی وحشت تھے جو مرزا محمد جان نالاں کے چچا زاد بھائی اور مرزا حسین علی خاں برادر مہدی علی خاں صوبیدار بانس بریلی کے بیٹے تھے، خاندانی رئیس تھے، مصحفی ان کے بہت مداح ہیں، ریاض الفصحا کی ترتیب کے وقت ان کی عمر چالیس سال بتاتے ہیں[۳]، ان کے کلام کا نمونہ درج ذیل ہے:

گو رنگ رنگ کر گلے کیونکر نہ دے وحشت فشار
ایک مدت ہم رہے آغوش مادر سے جدا

ٹھہرا نہ کوئی بھی میرا آزار دیکھ کر
آنکھیں تلک تو پھر گئیں بیمار دیکھ کر

نگہ آفت، بلا قامت، اگر پیچ و دہن معدوم
جو دیکھو غور سے تو وہ صنم پتلا ہے جادو کا

ہے جا دہ جا بہر میں زوال کمال حسن
لکھا قضا نے یہ ورق مہر و ماہ پہ

رنگ ثبات بس کہ نہیں اس نگار میں
آتی ہے بوئے یاس گل انتظار میں

[۱] خمخانۂ جاوید ج ۳ ص ۳۱۰ ۔ [۲] خوش معرکۂ زیبا ورق ۔ (الف)، خمخانۂ جاوید ج ۳ ص ۵۳۳ ۔ طبقات الشعراء (مخطوطہ دار المصنفین اعظم گڑھ) [۳] ریاض الفصحا، صفحات ۲۵۰، ۲۵۳

کتنوں کی جان بخشی کریں گے وہ اب
کتنے ہی اس بات پہ مرجائیں گے

تیغ سے خنجر سے نہ ڈر جائیں گے
چین جبیں دیکھی تو مر جائیں گے

خوف اسیری میں رہائی کا ہے
ضعف یہی ہے تو کدھر جائیں گے

کاٹنی ہیں گور کی اندھیاریاں
کیا شب دیجور سے ڈر جائیں گے

از بس کہ مجھ کو مرگ سے اپنی سرور ہے
یہ گور کی بغل نہیں آغوش حور ہے

تن پروری سے اپنی ہے منظور نفع غیر
آخر تو ایک دن یہ بدن رزق مور ہے

منشی تقدیر کا ہوں گا گریباں گیر میں
بن پڑھائے لکھ دیا کیوں خط پیشانی مجھے

کس کے جلوے سے منور یہ مرا کاشانہ ہے
ہے گل خورشید گر گل بھی چراغ خانہ ہے

شاہ نیاز احمد نیاز بریلوی کا ذکر فارسی شعراء کے ضمن میں ہو چکا ہے، اگرچہ مصحفی نے ان کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کیا تھا، لیکن مصحفی کی شاعری کے عروج کے زمانہ میں انھوں نے مصحفی کو ایک غزل بغرض اصلاح بھیجی تھی[۱]، نمونۃً ان کے چند اردو شعر پیش ہیں،

مجھے چین خواب عدم میں تھا نہ تھا زلف یار کا کچھ خیال
یہ جگا کے شور ظہور نے مجھے کس بلا میں پھنسا دیا

وہ جو نقش پا کی طرح رہی تھی نمود اپنے وجود کی
سو کشش سے دامن ناز کے اسے بھی زمیں سے مٹا دیا

یا الٰہی زورق گرد وں سنبھال
بے طرح امڈا ہے یہ طوفان اشک

صبر و قرار و شکیب، تاب و تواں عقل و دیں
رہنے تو لی اپنی راہ رہ گئی کیوں جان تو

عقل کے مدرسے سے اٹھ عشق کے میکدے میں آ
جام فنا و بیخودی اب تو پیا جو ہو سو ہو

روشن شاہ روشن علایق دنیوی سے پاک ایک نو مسلم درویش تھے، اگرچہ مستقلاً میرٹھ میں رہتے تھے لیکن وطن بریلی تھا، وہ انیسویں صدی کے پہلے نصف دور کے شاعر ہیں اور صاحب دیوان تھے[۲]،

[۱] سخن شعرا، ص ۵۳۶ ۔ ریاض الفصحا، ص ۲۳۹ [۲] عمدۂ منتخبہ ص ۲۸۱ ۔ سخن شعراء، ص ۱۹۶

نمونۂ کلام پیش ہے :

غیر سے ہو دیں یار کی باتیں
ہیں یہ پروردگار کی باتیں

آپ کرتے ہیں بار بار نہیں
ہم کو ہاں کا بھی اعتبار نہیں

دیکھ کے مجھکو منہ چھپایا اور حیا کا نام کیا
واہ ری تیری دانشمندی اس میں بھی اک کام کیا

کونسی جا ہے کہ جس جا نہ گزر اس کا ہو
مثل خورشید جہاں دیکھئے گھر اس کا ہے

دل کی تپش سے گرمیٔ خورشید سرد ہے
سینہ اگر یہی ہو تو دوزخ بھی گرد ہے

کشور محبت کا پیش ہے سفر دل کو
عاشقو دعا کرنا اس کی کامیابی ہو

پری ہے رشک گل ہے نازنیں ہے
وہ اک غارتگرِ دنیا و دیں ہے

نہ دنیا کا رہا میں اور نہ دیں کا
نہ چھوڑا عشق نے مجھ کو کہیں کا

داغوں سے عشق کے ہو گلزار باغ دل کا
فردوس سے ہے بہتر اب کچھ دماغ دل کا

گل کی روش کھلا ہے ہر ایک داغ دل کا
گاہے تو سیر کیجیے ہے طرفہ باغ دل کا

کرامت علی خاں شہیدی ولد عبد الرسول خاں عروضی لکھنؤ کے باشندے تھے، لیکن زندگی کا کافی حصہ بریلی اور رامپور میں گزرا، بعض تذکرہ نویسوں نے غالباً اسی وجہ سے انھیں بریلوی لکھا ہے فن شاعری میں شاہ نصیر اور مصحفی کے شاگرد تھے، زندگی کے آخری ایام میں مدینہ منورہ چلے گئے تھے، اور وہیں ۱۲۵۶ھ (مطابق ۱۸۴۰ء) میں انتقال ہوا[۱]، ان کے چند شعر بطور نمونہ درج ذیل ہیں :

قاتل نے پیش قبضۂ شمشیر سے نمک
رگڑا کباب پہلوئے نخچیر سے نمک

نام میت کا سنے سے جسے غش آتا ہو
وہ جنازے پہ شہیدی کے مقرر آیا

ایام مصیبت کے تو کاٹے نہیں کٹتے
دن عیش کی گھڑیوں میں گزر جاتے ہیں کیسے

[۱] گلشن بیخار ص ۱۱۲، سخن شعرا، ص ۲۷۴، تذکرۂ نادر ص ۹۰، خوش معرکۂ زیبا، ورق ۱۳۰ (ب)

مصحفی کے ایک دوسرے بریلی کے رہنے والے شاگرد، جو بجائے خود اساتذہ میں شمار ہوتے تھے، شیخ علی بخش بیمار تھے، وہ ابتداءً احمد خاں غفلت سے اصلاح لیتے تھے، اور نہایت پرگو تھے، انھوں نے کئی دیوان مرتب کیے تھے لیکن سب تلف ہو گئے، عربی و فارسی میں استعداد کامل رکھتے تھے، نواب سعید خاں والی رامپور کی فرمائش سے انھوں نے بوستان خیال کے کچھ حصوں کو شعر کا جامہ پہنایا تھا، لیکن وہ بھی اب ناپید ہے، ان کا جو کچھ کلام ملتا ہے وہ نہایت دلکش و موثر اور سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے اور ان کی استادی کی شہادت دیتا ہے، ان کا انتقال ۱۴ ربیع الاول ۱۲۷۱ھ (مطابق ۱۸۵۵ء) کو رامپور میں ہوا[۱]، ان کے چند اشعار درج ذیل ہیں :

کون پرساں ہے حال بسمل کا
خلق منہ دیکھتی ہے قاتل کا

سانس آہستہ لیجیو بیمار
ٹوٹ جائے نہ آبلہ دل کا

نہ بنا تا جو دن جدائی کا
کیا بگڑتا تری خدائی کا

نہ رہنے دے گی وحشت تنگدے میں
اٹھو بیمار جو مرضی خدا کی

بیاں ہو عیب طبیعت یہ ہو چکا مجھ سے
خدا کرے کہ نہ پوچھیں وہ مدعا مجھ سے

کہیں سنی ہیں یہ نازک مزاجیاں بیمار
کر اٹھ سکی نہ حسینوں کی التجا مجھ سے

اب اور آرزو نہ رہی اے خدا مجھے
کیا درد دل دیا کہ سبھی کچھ دیا مجھے

دل چاک چاک ابروئے خمدار نے کیا
کعبہ کو کربلا تری تلوار نے کیا

مسجد میں پی شراب پڑھی دیر میں نماز
بیمار کو شعور کسی بات کا نہیں

موت سے بھاگنے لگے بیمار
کیا اسے تم شکستہ پا سمجھے

اور مطلب آہ سوزاں سے نہیں
خاک ہونے کی تمنا ہے مجھے

[۱] انتخاب یادگار، ص ۱۸۰، تذکرہ شعرائے رامپور، خمخانۂ جاوید، جلد اول ص ۶۸۳

بیمار کو غفلت ہے بہت خیر نہیں آج ہر چند کہ تھی حالتِ غش کل مگر ایسی
ہر روز وہ پھر جاتے ہیں در تک مرے آکر کچھ جذبِ محبت کو لگی ہے نظر ایسی
جنت میں حیاتِ ابدی خاک ملے گی دنیا میں تو مانگی نہ ملی موت خدا سے

بیمار کے ایک معاصر محمد ضیا خاں یاس تھے، جو حافظ رحمت خاں کے پوتے اور احمد خاں غفلت کے شاگرد تھے، بڑے پُرگو شاعر تھے، کلام بہت تھا لیکن تلف ہو گیا، ۱۲۶۶ھ (مطابق ۱۸۵۱ء) میں یاس نے وفات پائی[1]، نمونۂ کلام درج ذیل ہے:

گھر میں آنے سے مرے آپ کو ڈر کس کا ہے شوق سے لایئے تشریف یہ گھر کس کا ہے
یاس اب تو سوائے ذاتِ خدا ہم کسی کے نہ کوئی اپنا ہے

اسی دور کے ایک شاعر مشہور بریلوی بھی ہیں، جن کے متعلق صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ بریلی کے ایک کائستھ گھرانے کے فرد تھے، شیفتہ نے ان کا صرف ایک درج ذیل شعر نقل کیا ہے[2]۔ رعایتِ لفظی کے دلدادہ معلوم ہوتے ہیں۔

خوشی سے کیوں نہ اے مشہور اب بغلیں بجائیں ہم ملے گا یار ہم سے آج پھر بازو پھڑکتے ہیں

(باقی)

۱؎ انتخاب یادگار، ص ۱۰۴ ۲؎ گلشن بیخار، ص ۱۱۰

عماد الدین الاصفہانی مورخ و ادیب

از جناب محمود الحسن صاحب، شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

عماد الدین اصفہانی تاریخ اسلام کی اہم علمی شخصیتوں میں ہے، اس کی سرگرمیوں کا جائزہ لینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس دور کا مختصر تذکرہ کر دیا جائے جس میں اُس نے آنکھیں کھولیں اور اسکی نشو و نما ہوئی،

عماد الدین بارہویں صدی کے نصف آخر میں پیدا ہوا، اُس وقت سلاجقہ کی عظیم الشان حکومت مختلف ٹکڑوں میں تقسیم ہو رہی تھی، کئی آزاد سلجوق حکمرانوں کے غلام اپنے کمزور آقاؤں پر حاوی ہو گئے تھے، یا انھیں ختم کر کے اپنی حکومتیں قائم کر رہے تھے، عباسی اقتدار جو سلاجقہ کے گرم اور بہادر خون سے نئی زندگی حاصل کر چکا تھا، وہ بھی اب کمزور ہو چکا تھا، ان دونوں میں اتنی قوت نہیں تھی کہ اس انتشار کی شیرازہ بندی کر سکیں، شام پر تتش کے غلام طغتگین نے اپنے اقتدار اعلیٰ کا اعلان کر دیا تھا، موصل میں عماد الدین زنگی نے ایک نئی آزاد سلطنت کی داغ بیل ڈالدی تھی، مصر میں فاطمیوں کی حکومت تھی جو افریقہ تک پھیلی ہوئی تھی، مگر اس میں بھی زوال کا گھن لگ چکا تھا، اندلس عرب قبائل اور مقامی باشندوں کی کشاکش کی آماجگاہ بنا ہوا تھا، پروس کی عیسائی حکومتیں اندلس کے باشندوں کی مدد کرتی رہتی تھیں، بحر روم کے مشرقی ساحل پر آباد ریاستوں کی حالت اور بھی ناگفتہ بہ تھی، اس دور کی ابتری کا نقشہ ہم عصر مورخ ابن الاثیر نے ذیل کے الفاظ میں پیش کیا ہے:

"عماد الدین کی ملک گیری کا حال بیان کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کے سلا

کی زبوں حالی اور ضعف اور مشرکین کی قوت اور کامرانی کا حال بیان کیا جائے، جس وقت عماد الدین شہید حکمراں ہوا تو فرنگیوں کی مملکت کا دائرہ بہت وسیع ہو چکا تھا، انکی فوجی قوت میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا تھا، ان کی ہیبت کا سکہ جم چکا تھا، وہ اسلامی ملکوں پر مسلسل دست درازی کر رہے تھے، مسلمان اپنا دفاع کرنے میں ناکام تھے، فرنگیوں کی بربریت کا دور دورہ تھا مسلمان اہانت و ذلت کی زندگی بسر کر رہے تھے، ماردین و شبختان کے کنارے سے لیکر عریش مصر تک ان ہی کا بول بالا تھا، صرف حلب، حمص، حماۃ اور دمشق مسلمانوں کے زیر اقتدار تھے، عیسائیوں کے فوجی جتھے دیار بکر سے آمد تک اور جزیرہ سے نصیبین و راس العین تک لوٹ اور غارتگری پھیلائے ہوئے تھے، رقہ و حران کے لوگ ذلت و اہانت کے ساتھ اُن کا ساتھ دینے پر مجبور تھے، دمشق کا راستہ بند ہو گیا تھا، جو تجارتی قافلہ وہاں پہنچنا چاہتا تھا تو اسکو میدانوں اور جھاڑ جھنکاڑ سے بھرے ہوئے ویرانوں سے گذرنا پڑتا جس میں عرب لٹیروں کی غارتگری کا ہر وقت خطرہ رہتا تھا، رفتہ رفتہ فرنگیوں کا اثر اتنا بڑھ گیا کہ بڑے دیسی شہروں میں وہ زبردستی گھس کر خراج وصول کرتے تھے، ان کی جرأت کا یہ عالم تھا کہ دمشق کے عیسائی غلاموں کو یہ حق دلایا کہ اگر وہ چاہیں تو اپنے آقاؤں کے پاس رہیں، چاہیں اپنے وطن و اہل و عیال کے پاس لوٹ جائیں، چنانچہ جس نے غلامی میں رہنا پسند کیا اس کو انھوں نے چھوڑ دیا، باقی سب کو آزاد کرا لے گئے۔ اس سے زیادہ مسلمانوں کی ذلت و سیاسی پستی کا اور کیا عالم ہوگا، حلب و حماۃ کے وہ حصے دار ہو گئے تھے، ان کے علاوہ باقی ملک شام کی حالت اور بھی ابتر تھی[1]"

اسی سیاسی زوال کے نتیجہ میں اخلاقی و مذہبی حالت بھی ابتر ہو چکی تھی، احناف و شوافع کا

[1] تاریخ دولت اتابکیہ ابن الاثیر ص ۴۲ - ۴۹

اختلاف محض ذہنی و فکری میدانوں تک محدود نہیں تھا بلکہ اس کے مظاہر جنگ و جدال کی شکل میں پیدا ہو چکے تھے، اس کو ہوا دینے میں ان خفیہ تنظیموں اور خود غرض جماعتوں کا بھی ہاتھ تھا جو معاشی و سیاسی اسباب کی بنا پر اُس وقت کے سیاسی نظام سے غیر مطمئن تھیں، یہ گروہ کبھی کبھی خود بھی متشددانہ رویہ اختیار کر لیتا تھا اور جہاں بھی موقع ملتا قتل و غارت برپا کرتا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت کے مسلمان سیاسی، معاشی اور اخلاقی تصادم و انتشار کے ہمہ جہت حملوں کا شکار ہو گئے۔

ایسے تاریک و ہمت شکن دور میں سلاجقہ کے غلاموں میں سے ایک نامور غلام آقسنقر کا بیٹا عماد الدین امید کی روشنی بنکر نمودار ہوا، اس نے بڑی دور اندیشی سے کام لیا، سب سے پہلے ناکارہ اور بے جان چھوٹے چھوٹے سلاطین کو ختم کیا، اس کے بعد اندرونی سیاسی فضا کو ساز گار بنایا اور بڑی بہادری اور فیصلہ کن جرأت کے ساتھ صلیبیوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو نہ صرف روکا بلکہ بقول لین پول "صلیبیوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کا محافظ اور صلاح الدین کا صحیح معنوں میں پیش رو ثابت ہوا"[1]

اس خاندان نے سیاسی، تعلیمی، معاشی اور اخلاقی ہر میدان میں شاندار کارنامے انجام دیے، اسی گھرانے کے ایک زبردست حکمراں نور الدین زنگی کے دو مشہور فوجی افسر شیرکوہ و صلاح الدین نے جو چچا بھتیجے تھے، اپنی فوجی قوت اور بے مثال جنگی مہارت سے یورپ کی متحدہ قوتوں کا بڑھتا ہوا سیلاب روک دیا، یہی زمانہ ہے جب عماد الدین کاتب الاصفہانی پیدا ہوا، اور اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے۔

اصفہانی کا نام محمد، باپ کا صفی الدین، عماد الدین لقب تھا، ۵۱۹ھ میں اصفہان میں پیدا ہوا[2] مگر ابن الفوطی نے اپنی کتاب مجمع الآداب میں اس کو عربی النسل اور قریشی لکھا ہے[3]، اصفہان میں پیدائش کی وجہ سے بہت سے مورخین کو دھوکا ہوا کہ وہ ایرانی النسل ہے، بچپن اور

[1] Munammadan dynasties Lane Pool. P162 [2] طبقات الشافعیہ، السبکی ج ۴ ص ۹۷، وفیات الاعیان ابن خلکان ج ۲ ص ۴۸، [3] خریدۃ القصر وجریدۃ العصر، عماد الدین الاصفہانی، مرتبہ محمد بہجۃ الاثری ج ۱ ص ۹

ابتدائی حالات کے بارے میں مورخین خاموش ہیں، لیکن قیاس ہے کہ اس نے تقریباً ۱۵ سال اصفہان میں گذارے اور یہیں قرآن، حدیث، منطق، حساب اور فقہ وغیرہ کی ابتدائی تعلیم حاصل کی،

عماد الدین کا گھرانہ شعر و ادب، علم و فضل اور دنیاوی وجاہت میں مشہور تھا، اسکے دادا شعر و ادب کے شیدا تھے، چچا بھی شاعر تھے، محمود بن محمد بن ملک شاہ سلجوقی کے وزیر اور اپنے دور کے نامور مدبر تھے، عماد الدین کا دوسرا بھائی تاج الدین خلیفۂ بغداد کا سفیر بن کر صلاح الدین کے دربار میں گیا تھا، عماد الدین کی ماں دولت سلجوقیہ کے نامور امیر امین الدین کی لڑکی تھی، عماد نے اپنے نانا کو دیکھا تھا۔

عماد الدین کی پرورش فارسی ماحول میں ہوئی، اس ماحول نے اس کو شعر و ادب کیجانب مائل کر دیا، پہلی دفعہ ۵۳۴ھ میں بغداد آیا اور حصول تعلیم کے بعد ۵۴۳ھ میں اصفہان واپس ہوا اور یہاں کے مشہور فقیہ خجندی اور ورکانی سے فقہ حاصل کی، ۵۴۸ھ میں وہ مستقل قیام کی غرض سے بغداد آگیا، اس دوسرے سفر میں اس نے نظامیہ کالج میں تعلیم کی تکمیل کی، اس وقت یہاں مشہور فقیہ و ادیب علی ابو منصور سعید بن رزاز درس و تدریس کے منصب پر فائز تھے، ان کی توجہ سے اصفہانی میں فقہ کا ذوق پیدا ہوا اور اختلافی مسائل میں گہری نظر اور نحو و ادب میں اچھی صلاحیت پیدا کی، حدیث میں ابوالحسن علی بن ہبۃ اللہ، ابو منصور محمد ابن عبدالملک بن جیرون، ابوالمکارم مبارک بن علی سمرقندی اور ابوبکر احمد بن علی الاشقر جیسے اساتذۂ فن سے شرف تلمذ حاصل تھا، شعر و شاعری کا ذوق موروثی تھا، اس میں پختگی قیام بغداد کے زمانہ میں حاصل ہوئی، اعلیٰ درجہ کا انشاء پرداز تھا، فقہ شافعی سے متعلق ہونے کی بنا پر شافعی کہلایا۔

عماد الدین کے اساتذہ کی فہرست خاصی لمبی ہے، چند کے نام درج کیے جاتے ہیں:

ابوالقاسم ابن الحصین (۴۳۲ھ - ۵۲۵ھ)، ابوعبداللہ الفرادی (۴۴۲ھ - ۵۳۰ھ)، جمال الدین ابن الاخوۃ الشیبانی، ابن بنا، البغدادی (۴۵۳ھ - ۵۳۱ھ)، ابوالبرکات نیشاپوری (۴۴۵ھ - ۵۴۱ھ)، ابوالفتوح الاسفرائینی (۴۷۴ھ - ۵۳۸ھ)، ابن عبدالسلام البغدادی (۴۵۱ھ - ۵۳۹ھ)، ابوالمکارم السندی (۵۳۹ھ - ۵۴۰ھ)، ابن الصباغ (۵۴۲ھ)، ابوالمعالی الورکانی (۵۵۹ھ)، ابویوسف الدمشقی (۵۶۳ھ)، زین الاسلام ابن الجزیری (۵۵۶ھ)، ابوالفوارس التمیمی (۵۶۴ھ)، ابن الحکیم ابن الاحمر التیمی، ابن ذی البراغنیق النظری، ابن عساکر (۴۹۹ھ - ۵۷۱ھ)، ابوطاہر السلفی (۴۷۸ھ - ۵۷۶ھ)، ابوزرعۃ المقدسی (۴۸۱ھ - ۵۶۶ھ)، ابن عوف الزہری الاسکندرانی (۵۸۱ھ)۔

عماد الدین نے اپنی عمر کا بہترین حصہ بغداد ہی میں گذارا، وہاں کی سنجیدہ علمی محفلوں میں اس کا نام عزت و احترام سے لیا جاتا تھا، اور اس کی جودت طبع اور ذہانت کی وجہ سے ان محفلوں میں اس کو نمایاں مقام حاصل تھا، اسی زمانہ میں اس کی شخصیت کا چرچا بغداد سے باہر دوسرے علمی مراکز میں بھی ہونے لگا تھا، اور حکمراں طبقوں میں بھی وہ معروف ہو گیا تھا،

عملی زندگی میں داخل ہونے سے پیشتر اس نے بیشتر اسلامی ملکوں کی سیاحت کی تھی اور ان کے اکابر علماء سے ملا تھا، صفدی نے لکھا ہے کہ عماد نے اسکندریہ میں سلفی سے روایت اور سماعت کیا،[1] اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسکندریہ جاتے ہوئے اس نے موصل، دمشق اور عراق و شام کے دیگر شہروں میں قیام کیا ہوگا، جہاں اعلیٰ درجہ کے مدارس موجود تھے، ان میں بڑے بڑے علماء و فضلاء درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے، اسکندریہ سے واپسی میں مشہور وزیر عون الدین یحییٰ بن ہبیرہ سے ربط و ضبط پیدا ہوا، عون الدین چند ہی دنوں میں عماد کی

[1] معجم الادباء - یاقوت حموی، ج ۱۹ ص ۲۸-۱۱ - الوافی بالوفیات خلیل الصفدی ج ۱ ص ۱۴۵-۱۳۲

صلاحیت اور شخصیت سے اتنا متاثر ہوا کہ اس کو بصرہ پھر بعد میں واسط کا منتظم مقرر کر دیا[1] عماد الدین نے اس کی جانب اشارہ کیا ہے، وہ لکھتا ہے "میں مقتفی باللہ کے زمانہ میں بغداد آیا اور خلیفہ کی مدح میں سب سے پہلا قصیدہ لکھا، یہ وہ زمانہ تھا جب محمد شاہ نے بغداد سے محاصرہ اٹھا لیا تھا، اس وقت میں دربار سے وابستہ ہوگیا اور عون الدین ابن ہبیرہ نے مجھے اعلیٰ مناصب عطا کیے"[2] جب تک عون الدین زندہ رہا عماد الدین عزت و خوشحالی سے زندگی بسر کرتا رہا، مگر اس کے انتقال کے بعد ہی آزمایش اور پریشانی میں مبتلا ہوگیا، عماد الدین اور اس کے تمام ساتھیوں کو قید میں ڈالدیا گیا، اور طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں، یہ مستنجد باللہ کا زمانہ تھا، اس کے ایک اعلیٰ عہدہ دار عماد الدین بن عضد الدین بن رئیس الرؤسا سے عماد کے گہرے تعلقات تھے، عماد نے ایک پرزور قصیدہ لکھکر خلیفہ سے رحم کی درخواست کی، جو افسر مذکور کی سفارش پر قبول ہوئی اور عماد چھوڑ دیا گیا، ساتھ ہی اس کا وزینہ بھی بڑھا دیا گیا،[3] اس کے باوجود عماد الدین خوش نہیں تھا، اسکے مخالفین آئے دن سازشیں اور ایذا رسانی کے طریقے اختیار کرتے رہتے تھے، معاشی سکون بھی حاصل نہیں تھا، تنگی و عسرت سے زندگی بسر ہوتی تھی، آخر کہاں تک تاب لاتا مجبوراً بغداد چھوڑ کر دمشق کی راہ لی، ۵۶۲ھ میں دمشق پہنچا، اس زمانہ میں نور الدین کا ستارہ اوج کمال پر تھا، خوش قسمتی سے اس کے ارد گرد لائق اور فرض شناس افسر اور منتظم جمع تھے، ان میں مشہور قاضی کمال الدین ابوالفضل محمد بن شہرزوری بھی تھے، ان کا تدبر اور معاملہ فہمی اس زمانہ میں مسلم تھی، نور الدین اگر صاحب شمشیر تھا، تو قاضی صاحب قلم، مدبر اور منتظم ریاست تھے، عماد الدین کی قابلیت اور ذہانت کا چرچا دور دور پھیل چکا تھا، اسی لیے جب وہ بغداد سے دمشق آیا، تو قاضی کمال الدین کے یہاں ٹھہرا، قاضی صاحب نے دمشق کے مشہور شافعی مدرسہ نوریہ میں تعظیم و تکریم کے ساتھ ٹھہرایا، کمال الدین

[1] الوافی بالوفیات صلاح الدین الصفدی ج ۱ ص ۱۳۲-۲۵ [2] خریدۃ القصر وجریدۃ العصر، عماد الدین، القسم العراقی ج ۱ ص ۳۶-۳۹
[3] ایضاً ص ۱۶۶-۱۶۷

قاضی القضاۃ تھے، بڑے بڑے امراء، وزراء اور خود سلطان ان کا بڑا احترام کرتے تھے، زنگی مملکت میں عدلیہ کو بڑی اہمیت حاصل تھی، انصاف و عدل اس کا اعلیٰ نصب العین تھا، قاضی صاحب کے وسیلے اور عماد کی ذاتی شہرت و لیاقت کی وجہ سے اس کی بڑی پذیرائی ہوئی، حکمراں طبقہ سے عماد الدین کے خاندانی مراسم بھی تھے، نجم الدین ابوالشکر ایوب اور اسد الدین شیرکوہ نے پرانے تعلقات کو یاد رکھا تھا، نجم الدین قلعہ تکریت کا والی تھا، سلطان محمود بن محمد بن ملکشاہ نے عماد الدین کے چچا احمد بن حامد کو اسی قلعہ میں قید کر دیا تھا، نجم الدین نے ازراہ انسانیت احمد کو بچانے کی بڑی کوشش کی تھی، مگر کامیابی نہیں ہوئی تھی[1]، اس لیے بھی عماد الدین سے لوگ واقف تھے، جب اس کے آنے کی اطلاع نجم الدین کو ملی تو وہ فوراً ملاقات کے لیے آیا، عماد الدین نے اس عزت افزائی کے شکرانے میں ایک پرزور قصیدہ لکھکر اس کی خدمت میں پیش کیا،[2]

قاضی کمال الدین نے سلطان نور الدین سے عماد الدین کی بڑی تعریف کی، اس کے علم و فضل اور انشا پردازی کا پرزور الفاظ میں تذکرہ کیا، چنانچہ سلطان نے عماد الدین کو دیوان الانشاء میں ملازمت کی پیشکش کی،[3] پہلے اس کو قبول کرنے میں جھجک محسوس ہوئی، وہ خود لکھتا ہے "میں اس ذمہ داری کو قبول کرتے ہوئے پس و پیش میں تھا، کیونکہ یہ کام بالکل نیا تھا، مگر[4] یہ پس و پیش ایک نو آموز کی نفسیاتی کیفیت تھی، ورنہ اس کی اہلیت مسلم تھی، چنانچہ جب اس کام کو شروع کیا تو بڑی خوش اسلوبی اور کامیابی سے اس کو انجام دیا، وہ عربی زبان کا ادیب و انشا پرداز تو تھا ہی، فارسی پر بھی یکساں قدرت حاصل تھی،[5] چنانچہ اس نے چند دنوں میں اپنی قابلیت، حسن خدمت اور حسن معاملگی سے سلطان کو اتنا متاثر کیا کہ وہ اس کی

[1] مراۃ الزمان فی تاریخ الاعیان، ج ۸-۱ ص ۲۷۰، حیدرآباد اڈیشن [2] ایضاً ج ۸ ص ۳۲۲،
[3] الاعلام، خیر الدین زرکلی، ج ۷، ص ۲۵۴-۲۵۳ [4] وفیات الاعیان، ابن خلکان ج ۲ ص ۲۳۵
[5] معجم الادباء، یاقوت الحموی ج ۱۹ ص ۱۳۔

بڑا اعتماد کرنے لگا، اہم ملکی امور میں اس سے مشورہ کرلیتا تھا، اسی اعتماد کی بنا پر اس کو مستنجد باللہ کے دربار میں سفیر بنا کر بھیجا، اور جب عماد الدین بغداد سے واپس آیا نور الدین نے اس کو مدرسۂ نوریہ میں منصب درس پر مامور کیا، غالباً یہ ۵۶۷ھ کا زمانہ تھا، مگر حموی کا خیال ہے کہ ۵۶۶ھ میں مدرسہ میں مامور ہوا اور ۵۶۸ھ میں دیوان اشراف میں تقرر ہوا۔

یہی زمانہ ہے کہ جب صلاح الدین ایوبی سلطنت نوریہ کے ایک ممتاز فوجی افسر کی حیثیت سے منظر عام پر آیا تھا، اس سے عماد الدین کے مراسم پیدا ہوگئے جو رفتہ رفتہ گہری دوستی میں بدل گئے اور دونوں میں باہم بڑا اعتماد پیدا ہوگیا، اور عماد الدین بڑی مسرور و مطمئن زندگی بسر کرنے لگا، مگر اسی اثنا میں نور الدین کا انتقال ہوگیا، اس حادثہ نے عماد کے مستقبل پر دور رس اثرات چھوڑے۔

نور الدین کے انتقال کے بعد اس کا لڑکا ملک الصالح اسمٰعیل جانشین ہوا، اس وقت وہ بہت کمسن تھا، اس کی کم عمری سے فائدہ اٹھا کر امراء کی ایک جماعت اس پر حاوی ہوگئی، اور سلطان ذہنی ناپختگی کی وجہ سے ان کا آلۂ کار بن گیا، اور امراء کی وہ جماعت جو نور الدین کے زمانہ ہی سے عماد الدین سے حسد رکھتی تھی، مگر بے بس تھی، اب سامنے آگئی، اس نے عماد الدین کو تنگ کرنا شروع کردیا، جب اس سے مطلب برآری نہیں ہوئی تو ڈرانا اور دھمکانا شروع کردیا، آخر میں عماد الدین نے مجبور ہوکر دمشق چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا، اور بغداد کے ارادہ سے وہ موصل پہنچا، یہاں کے دوران قیام میں سخت بیمار پڑا، مگر حیات باقی تھی، اور خدا کو اس سے کام لینا منظور تھا، اس لیے صحتیاب ہوگیا، موصل ہی میں اس کو پتہ چلا کہ صلاح الدین مصر سے دمشق پر قبضہ کی غرض سے روانہ ہوچکا ہے، یہ خبر امید نو کا پیام ثابت ہوئی، وہ بغداد کا ارادہ ترک کرکے ۵۷۰ھ میں شام لوٹ آیا، دمشق پہنچکر معلوم ہوا کہ صلاح الدین حلب میں مقیم ہے، اس لیے حلب جاکر صلاح الدین سے ملاقات کی، صلاح الدین اس سے مل کر بہت خوش ہوا اور اس کی قدر افزائی کی اور اس کو

اپنی مصاحبت میں لے لیا، عماد الدین نے اس کی شان میں ایک قصیدہ لکھا جس کے چند اشعار حموی نے معجم الادبا میں نقل کیے ہیں، اس کے بعد وہ زیادہ تر صلاح الدین کے ساتھ رہنے لگا، سلطان جہاں بھی جاتا عماد الدین کو اپنے ساتھ لیجاتا، اور کبھی کبھی اس سے سکریٹری کا کام لینے لگا، ایک مرتبہ قاضی فاضل نے سلطان سے عرض کیا "آپکے پاس عربی کے علاوہ دوسری زبانوں میں بھی خطوط آتے ہیں، جس سے مشکل پیدا ہوتی ہے، اس لیے اس کو حل کرنے کے لیے عماد الدین بہت موزوں ہیں"، صلاح الدین نے جواب دیا میں تمھیں کیسے چھوڑ دوں، تم میرے وزیر اور سکریٹری ہو، تمھاری ذات میں مجھے برکت نظر آتی ہے، اگر میں کسی اور کو مقرر کردوں تو دنیا کیا کہے گی، قاضی نے کہا کہ ترجموں کا معاملہ اہم ہے، اکثر میں غائب بھی رہتا ہوں، میری عدم موجودگی میں عماد الدین بحسن و خوبی میری قائم مقامی کرسکیں گے، آپ نے سلطنت نوریہ میں ان کو قریب سے دیکھا ہے، اس لیے میری رائے ہے کہ سکریٹری کا عہدہ انھیں سونپ دیجئے[1]، اس مشورہ اور عماد کی مسلمہ صلاحیت کی بنا پر وہ نہ صرف سکریٹری کے عہدہ پر مامور بلکہ معتمد وزارت کے عہدہ پر بھی ممتاز ہوا، جب کبھی قاضی الفاضل ملک کے باہر جاتے تو عماد الدین ان کی نیابت کرتا تھا، اس عہدہ کی وجہ سے صلاح الدین کے امراء اور مصاحبین اس کا بڑا لحاظ کرتے تھے، وزیر اعظم قاضی الفاضل عماد الدین کی ذہانت و فطانت کے بڑے معترف تھے، اس لیے بڑی شان و شوکت کے ساتھ صلاح الدین کے دربار میں چند سال گذارے، مگر ۱۱۹۳ء میں صلاح الدین کے انتقال[2] کے بعد عماد کا ستارہ پھر گردش میں آگیا اور وہ پریشانیوں میں مبتلا ہوگیا،

صلاح الدین کی موت کے بعد اسکی مملکت اسکے سب لڑکوں میں بٹ گئی، عزیز کو مصر کا علاقہ ملا اور افضل کو شام کا، عماد الدین نے کوشش کی کہ افضل کے یہاں رسوخ حاصل کرکے اپنی

---

[1] القاضی الفاضل، ڈاکٹر احمد البدوی ص ۲۱ [2] SaladimPrince of chinolry

عزت و اقتدار کو بحال کرلے، مگر کامیابی نہیں ہوئی، اس نے اپنے مشہور رسالہ "العتبی والعقبیٰ" میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ "جب سلطان کا انتقال ہوا اور اس کی اولاد اس کی جانشین ہوئی تو مصر میں عزیز نے اپنے باپ کے مصاحبین اور وزرا کو اسی عزت و احترام سے انکے سابق عہدوں پر برقرار رکھا، ان کی ہر طرح قدر دانی کی، اس کے مقابلہ میں افضل نے تمام وزرا، مصاحبین اور اعلیٰ حکام کو برطرف کرنا شروع کر دیا، افضل نے یہ طرز عمل محض چند لوگوں خاص طور پر ضیاء الدین ابن الاثیر کے اشارہ پر اختیار کیا تھا، ضیاء الدین ہی کے ایماء پر صلاح الدین کا مایۂ ناز وزیر قاضی الفاضل دمشق چھوڑنے پر مجبور ہوا،

جب عماد الدین کو افضل کے یہاں کامیابی نہیں ہوئی تو وہ مصر گیا، افضل نے اتنی مہربانی کی تھی کہ اس کو ایک سفارشی خط اپنے بھائی عزیز کے نام دیدیا تھا، عزیز کو اپنے بھائی افضل کی سیاست سے اتفاق نہیں تھا، اس لیے صلاح الدین کے امرا، اور علماء نے عزیز کو آمادہ کیا کہ سلطنت کی تقسیم مناسب نہیں ہے، اس کے استحکام کے لیے پھر دونوں کو متحد کرنا ضروری ہے، چنانچہ عزیز اور اس کے چچا عادل نے ۵۹۲ھ میں افضل پر فوجکشی کی، دونوں میں شدید جنگ ہوئی عزیز نے افضل کو شکست دے کر دمشق پر قبضہ کر لیا اور افضل اور اس کے وزیر ضیاء الدین دونوں کو نکالدیا، اور اپنے چچا عادل کو دمشق کا والی مقرر کیا، اس کے بعد عادل کا لڑکا معظم جانشین ہوا، عماد الدین ان دونوں کے ساتھ رہا اور تصنیف و تالیف کرتا رہا، کچھ عرصہ کے بعد محمد بن ملک العادل کے ہمراہ مصر آیا، اسی دوران میں مصر میں زبردست قحط پڑ گیا، ہزاروں انسان بھوکوں مرنے لگے بہت سے لوگ ملک چھوڑ کر آس پاس کے ملکوں میں چلے گئے، کچھ لوگوں نے حجاز و شام کی راہ لی، ان ہی میں عماد الدین بھی تھا، وہ دمشق چلا آیا،

عماد الدین قحط کے منہ سے نکلا تھا کہ ۵۹۶ھ میں ایک زبردست زلزلہ آیا، اس نے آذربیجان

سے لیکر مصر تک ہلا کر رکھ دیا، سیکڑوں شہر تباہ ہو گئے، جان و مال کا بیحد نقصان ہوا، اس تباہی کا تذکرہ بیشتر مورخین نے کیا ہے، اس وقت عماد الدین کی عمر ۸۷ سال کی تھی، ان آفات ارضی و سماوی نے اس پر گہرا اثر ڈالا، اور بڑھاپے اور ان خارجی موثرات نے اسے بیمار کر دیا، اور ۵۹۷ھ میں بڑی غمگینی و مایوسی کی حالت میں اس دنیا سے چل بسا، اس کو دمشق کے مقبرۂ صوفیہ میں دفن کیا گیا، عماد الدین کے انتقال سے چند مہینے پہلے قاضی الفاضل کا بھی انتقال ہو چکا تھا، عماد الدین کے ایک لڑکے کا ابن شداد نے ذکر کیا ہے، اور اس کا نام عزیز الدین لکھتا ہے، اس کی اولاد میں شیخ شرف الدین آٹھویں صدی میں بڑے عالم گذرے ہیں[1]،

عماد الدین نے کئی مفید کتابیں تصنیف کی تھیں، ان میں سے بعض چھپ چکی ہیں بعض ابھی غیر مطبوعہ ہیں، ایک کتاب کا نام "خریدۃ القصر و جریدۃ العصر" ہے، یہ کتاب شعر و ادب کی ہے، اور اسے ہم تذکرۂ شعرا، کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں، یہ دس جلدوں میں ہے[2]، اس کتاب میں ان شعراء کا کلام اور مختصر حال درج ہے جو ۵۰۰ھ اور ۵۷۰ھ کے درمیان، شام، عراق، جزیرہ، مغرب اور ایران میں گذرے ہیں، اس طرح اس دور کے بہت سے شعراء کے حالات محفوظ ہو گئے، اور ان کے کلام کے منتخب نمونے ہم تک پہنچ سکے، جو عماد الدین کا عربی ادب پر بڑا احسان ہے، شعرائے شام کا حصہ ڈاکٹر شکری فیصل نے اڈٹ کر کے ۱۹۵۵ء میں مصر سے شائع کیا ہے، مصر، صقلیہ، مغرب اور اندلس کے شعراء کا حصہ احمد امین اور شوقی ضیف وغیرہ نے اڈٹ کر کے دو جلدوں میں مصر سے طبع کرایا ہے،

دوسری کتاب "الفتح القسی فی فتح القدسی" ہے، یہ کتاب ان جنگوں کے حالات پر مشتمل ہے جو ۵۸۳ھ سے لیکر ۵۸۹ھ کے دوران صلیبیوں اور صلاح الدین ایوبی میں ہوئیں، اس میں فتح عکا، قیسار

---

[1] البدایہ والنہایہ، حافظ ابن کثیر ج ۱۳ ص ۳۱-۳۰، تاریخ ابو الفداء ج ۳ ص ۱۰۵، مفتاح السعادۃ ج ۱ ص ۲۱۵-۲۱۴، العبر فی خبر من غبر، ذہبی ج ۴ ص ۲۹۹، کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین، ابو شامہ ج ۲ ص ۲۴۵ [2] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین، ابو شامہ ج ۲ ص ۲۴۸

صیدا، بیروت، بیت المقدس کی لڑائیوں وغیرہ کے مشاہدات مندرج ہیں، یہ کتاب اس اعتبار سے بہت ہی اہم ہے کہ اس میں مصنف نے آنکھوں دیکھا حال قلمبند کیا ہے، اس کتاب کے متعدد قلمی نسخے یورپ اور ایشیا کے کتبخانوں میں موجود ہیں، بروکلمان نے اس کا ذکر کیا ہے[1]، اس کتاب کا غالباً پہلا اڈیشن ۱۳۲۱ھ میں مطبع موسوعات سے اور دوسرا مطبع خیریہ سے ۱۳۲۲ھ میں شائع ہوا[2]۔

تیسری کتاب البرق الشامی ہے، اس کتاب کے ناقص مخطوطات متعدد لائبریریوں میں موجود ہیں[3]، یہ کتاب اس زمانہ کے تاریخی مضامین پر مشتمل ہے جب عماد الدین، نور الدین و صلاح الدین سے منسلک تھا، یہ کتاب سات جلدوں میں پھیلی ہوئی ہے، اس کتاب کا پانچواں حصہ جو ۵۷۸ھ ۵۸۰ھ (۱۱۸۲ء۔۱۱۸۴ء) کے حالات پر مشتمل ہے، بودلیان، آکسفورڈ میں موجود ہے، اس کا انتخاب لائڈن میں بھی ملتا ہے، اس کا نمبر ۹۶۶-۸۲۴ ہے، بہجۃ الاثری نے اس کا عکسی نسخہ مجمع العلمی العربی دمشق میں دیکھا ہے، جس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے: "ذکر العزم علی قصد حلب وعبور الفرات الی بلاد الجزیرۃ والاستیلاء علیہا والنزول علی الموصل والعود الی سنجار واخذہا ۵۷۸ھ" یہ ۱۷۲ اوراق یعنی ۳۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

چوتھی کتاب "السیل علی الذیل" ہے، اس کتاب کو بعض مورخین خطیب کی تاریخ بغداد کا ضمیمہ بتاتے ہیں، جو اس نے ابن السمعانی کے ضمیمہ پر لکھا تھا[4]، مگر حموی اور صفدی دونوں کا خیال ہے کہ یہ کتاب خود اس کی تصنیف "خریدۃ القصر وجریدۃ العصر" کا ضمیمہ ہے۔

پانچویں کتاب "نصرۃ الفطرۃ وعصرۃ القطرۃ" ہے، یہ کتاب سلجوق خاندان کی تاریخ ہے، اس کا خلاصہ فتح بن علی البنداری نے "زبدۃ النصرۃ ونخبۃ العصرۃ" کے نام سے کیا ہے، جو تواریخ آل سلجوق کے نام سے چھپ گئی ہے، فتح بن علی نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ "عماد کی کتاب عبارت آرائی کی وجہ سے

۱؎ Brockel mamn, vol 1/548 ۲؎ ایضاً ۳؎ اعلام، خیر الدین زرکلی ج، ص ۲۵۴

اتنی طویل ہو گئی تھی کہ اصل مواد کو قابو میں لانا مشکل تھا، اس لیے اس کا خلاصہ کرنا پڑا[1]، بروکلمان نے اصل نسخہ کی نشاندہی کی ہے[2]، اس کتاب کا ذکر ابن خلکان، یاقوت الحموی نے بھی کیا ہے، صفدی نے عماد کی بعض اور تصانیف کا بھی ذکر کیا ہے، مثلاً کتاب "خطفۃ البارق وعطفۃ الشارق"، "کتاب عتبی الزمان فی عقب الحدثان" اور "نحلۃ الرحلۃ وحلیۃ العطلۃ"، صفدی نے انھیں علحدہ علحدہ کتاب تسلیم کیا ہے، مگر ابو شامہ نے "کتاب عتبی الزمان فی عقب الحدثان" کو "البرق الشامی" کا ایک حصہ قرار دیا ہے، اور ایک رسالہ کی حیثیت سے اس کا ذکر کیا ہے، ابو شامہ نے عماد الدین کے بعض تراجم کا بھی تذکرہ کیا ہے، چنانچہ لکھا ہے کہ امام غزالی کی کتاب "کیمیائے سعادت" کا عربی ترجمہ اس نے کیا تھا، ۵۶۶ھ میں اس ترجمہ سے فراغت ہوئی تھی[3]، ایک اور کتاب "فتور الزمان وصدور زمان الفتور" کا بھی ترجمہ کیا تھا، اس کا مصنف وزیر انوشروان بن خالد تھا، یہ تاریخ کی کتاب ہے، اس میں نظام الملک کے درمیانی عہد سے لیکر طغرل بن محمد بن ملک شاہ کے دور تک کے حالات ہیں[4]، اس کتاب کا ایک نسخہ بوڈلین میں موجود ہے، اس کا نمبر ۶۶۲ اور پیرس والے نسخہ کا نمبر ۲۱۴۵ ہے۔

مذکورہ کتب کے علاوہ علاء الدین کے خطوط و رسائل کا بڑا ذخیرہ ہے جسے جمع کیا جائے تو کئی جلدوں میں آئیں گے، یہ خطوط اس دور کے سماجی، معاشی، سیاسی اور اخلاقی ماحول کو سمجھنے میں بہت معاون ہو سکتے ہیں، انکے ذریعہ ایسے گوشوں پر روشنی پڑ سکتی ہے جو ہمارے لیے نئے ہونگے،

عماد الدین بحیثیت مورخ

عماد الدین ان مورخین کی صف میں شامل ہے جنھوں نے علاقائی اور خاندانی تاریخ مرتب کی ہے، اسے سوانح نگاروں کی صف میں بھی شامل کیا جاسکتا ہے، اسکی تاریخی کتابیں

۱؎ کتاب تاریخ دولۃ آل سلجوق، فتح ابن علی البنداری ص ۳ ۲؎ Brockl mam, S.1/568

۳؎ کتاب الروضتین، ابو شامہ ج ۲ ص ۱۷۱، ۴؎ ایضاً ج ۲ ص ۱۷۲

شخصیت، عہد اور کسی مخصوص علاقہ کے سیاسی حالات سے متعلق ہیں، اس لیے اس کو ان مسلم مورخین کے زمرہ میں شامل نہیں کیا جاسکتا جو عالمی تاریخ نگار کہے جاتے ہیں، اگرچہ محدود معنوں ہی میں سہی، اس کی مورخ کی حیثیت پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا عماد الدین کا کوئی نظریۂ تاریخ بھی تھا؟ اور وہ علم تاریخ کو دیگر علوم میں کیا مقام دیتا تھا؟ پہلے سوال کے جواب میں فتح القسی ہماری رہنمائی کرتی ہے، عماد الدین نے اس کتاب میں تاریخ کے بارے میں چند باتیں لکھی ہیں، ان کو سامنے رکھ کر اگر غور کیا جائے تو تاریخ کے بارے میں عماد الدین کے تصور کا استخراج ہو سکتا ہے، مثلاً وہ الفتح القسی میں لکھتا ہے: "اگر تاریخ نہ ہوتی تو سیاست کے مساعی فاضلہ ضائع ہو جاتے اور اچھی بری اشیا میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا۔"[1] یہ عبارت اگرچہ براہ راست تاریخ کا تصور پیش نہیں کرتی، لیکن بالواسطہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ عماد الدین تاریخ کو انسانی قوت تخلیق کا مظہر سمجھتا تھا، اور اس کا خیال تھا کہ تاریخ سیاست کے تدبر سے وجود میں آتی ہے، اصحاب سیاست جس طرح حکومت چلاتے ہیں وہی تاریخ بنجاتی ہے، اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ وہ تاریخ انسانی کو انفرادی قوتوں کا کرشمہ سمجھتا ہے، یعنی چند اشخاص ہی تاریخ پیدا کرتے ہیں، تاریخ کا یہ تصور مارکس سے پہلے مستند مانا جاتا تھا، اور جو آج بھی قدیم مورخین کے یہاں متعدد

اس تاریخی تصور سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ عماد الدین تاریخ کا وہ تصور نہیں رکھتا تھا جو عہد وسطیٰ کے مسیحی مورخین کے ذہن میں تھا، انکا خیال تھا کہ تاریخ مشیت ایزدی کا مظہر ہے، خدا کا ارادہ مادی شکل میں آنے کے لیے انسان کو بطور آلے کے استعمال کرتا ہے، یعنی انسان مشیت ایزدی کے ہاتھوں میں جکڑا ہوا ہے، اس کے اپنے ارادہ اور خواہش کا کوئی دخل نہیں، طبری نے اپنی تاریخ کے مقدمہ میں اسی تصور کی تائید کی ہے، اس کے برخلاف ابن الاثیر کے یہاں تاریخ کا

[1] الفتح القسی فی فتح القدسی ص ۵،

ارضی تصور ملتا ہے، اس نے تاریخ کا رشتہ انسان کی فکری جد وجہد اور تخلیقی قوتوں سے جوڑا ہے، یہی فکر عماد الدین کے ذہن میں بھی ہے، سخاوی نے عماد الدین کو ان مورخین میں شامل کیا ہے، جو تاریخ کے بارے میں اپنا ایک نظریہ رکھتے تھے،[1]

عماد کی منقولہ بالا عبارت سے یہ بات خاص طور سے واضح ہوتی ہے کہ وہ تاریخ کو دیگر علوم کی طرح ایک مفید علم سمجھتا تھا، کیونکہ یہ علم اچھے برے میں تمیز کرنا سکھاتا ہے، ماضی کے واقعات کا علم حال میں صحیح و غلط، مفید و غیر مفید اشیاء کے درمیان فرق کرنا سکھاتا ہے،

مورخ کی صفت یہ ہونی چاہیے کہ وہ واقعات کی تدوین میں صداقت کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دے، اس کی پوری کوشش کرے کہ اس کے بیانات سچے ہوں، کسی غلط محرک کا شکار نہ ہو، گروہی، نسلی، علاقائی، مذہبی اور خاندانی تعصبات سے بالاتر ہو کر واقعات کی تحقیق اور اسکو قلمبند کرے، عماد الدین نے اپنی کتابوں میں اس اصول کو پیش نظر رکھا ہے، اور اس کو برتنے کی کوشش کی ہے، چنانچہ لکھتا ہے، کہ میں نے مشاہدہ کے بعد واقعات قلمبند کیے ہیں، سبھی باتوں کو لیا ہے اور حق و صحت کو اپنایا ہے[2] لیکن اس دعویٰ کے باوجود وہ واقعات کی تحقیق میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوا ہے، اسکا ثبوت اس جنگ کے واقعات ہیں جو صلاح الدین اور سیف الدین کے درمیان ہوئی تھی، ابن الاثیر نے تعداد کی تردید کی ہے جو عماد الدین نے بیان کی ہے، مگر بحیثیت مجموعی عماد الدین کے بیانات باوثوق اور قابل اعتبار ہیں، چنانچہ خود ابن الاثیر نے بعض مواقع پر عماد الدین کی کتابوں کو بطور سند پیش کیا ہے۔

عماد الدین کا پیرایۂ بیان تاریخ کے لیے موزوں نہیں ہے، تاریخی واقعات کو لکھنے کے لیے جس سہل زبان اور سادہ اسلوب کی ضرورت ہے وہ اس کی تحریروں میں نہیں ملتا، وہ بہت

[1] سخاوی، الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ ص ۴۶۴-۵۴۰ ترجمہ الیف اوز نتھال

[2] الفتح القسی فی فتح القدسی ص ۹

مغلق، بلیغ اور مرصع عبارت لکھتا ہے جس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کے بجائے ادب کی کتاب ہے، عبارت آرائی کی وجہ سے مفہوم اور معنی کہیں کہیں خبط اور مبہم ہوگئے ہیں، اور تاریخی واقعات میں مبالغہ کا رنگ آگیا ہے، مگر اس دور کے دوسرے مورخین اس اسلوب سے متاثر نہیں ہوئے، مثلاً ابن القلانسی کی تاریخ دمشق، حموی کی ارشاد الاریب، ابن الاثیر کی الکامل اور ابن خلکان کی وفیات الاعیان کی زبان عام فہم سلیس اور متین ہے، بالخصوص الکامل کی سادگی قابل تعریف ہے۔

عماد الدین بہت بڑا ادیب تھا، عربی انشاء پر اس کو بڑی قدرت حاصل تھی، اسکی ایک نمایاں خصوصیت جدتِ طبع اور تخیل کی فراوانی ہے، ان دونوں نے اسکی تحریروں میں بڑی ندرت اور خوبی پیدا کردی ہے، ایک خط میں قاضی الفاضل لکھتا ہے "اس رسالہ میں صنعت تجنیس سے کام لیا ہے اور تطبیق، ترصیع، مقابلہ، موازنہ اور توشیح کا بھی استعمال کیا ہے" اس سے ادب انشاء پر اسکی قدرت اور اسکے اسلوب بیان پر روشنی پڑتی ہے، ان خصوصیات کا عکس اسکے تمام نثری سرمایہ میں نظر آتا ہے، خواہ وہ کسی موضوع سے متعلق ہو، تاریخ کے علاوہ ادبی موضوعات میں یہ طرز اس زمانہ کے مذاق کو دیکھتے ہوئے مذموم نہیں کہا جاسکتا، اس دور کے تمام ادباء جو سکریٹری اور وزراء کے عہدوں پر فائز تھے انکی ٹکسال میں یہی زبان معتبر تھی، خود قاضی فاضل جیسا بے مثل ادیب جسکا عماد الدین کی نثر پر گہرا اثر ہے اس طرز تحریر کا زبردست علمبردار ہے، مرصع اور مترنم زبان لکھنے والے دبا میں عماد الدین کا نام خاص طور پر ممتاز نظر آتا ہے۔

عماد الدین شاعر بھی تھا، اسکو ددھیال اور ننھیال دونوں طرف سے شاعرانہ ذوق ورثہ میں ملا تھا، اسکی شاعری کے نمونے خریدۃ القصر وجریدۃ العصر میں ہیں، ان سے عماد الدین کے قدرتِ کلام، جودتِ طبع، حسنِ فکر اور تخیل کی بلندی کا اندازہ ہوتا ہے، اسکے علیحدہ دیوان کا پتہ نہیں چلتا، عماد الدین نے سیکڑوں رسائل مختلف موضوعات پر تحریر کیے ہیں جو ابتک غیر مرتب شکل میں پڑے ہیں، یہ رسائل تنہا ادبی حیثیت ہی کے حامل نہیں ہیں بلکہ ان کے منظر عام پر آنے سے اس دور کے بہت اہم اور دلچسپ گوشوں پر روشنی پڑسکتی ہے۔

معین بن محمود کشمیری

اور

ان کی تصانیف

(صحیح بخاری کا ایک نادر نسخہ)

از جناب مولوی حکیم قاضی محمد عمران خاں صاحب نعمانی ایم اے سعیدیہ ڈسٹرکٹ لائبریری ٹونک

صحیح البخاری، اصح الکتب بعد کتاب اللہ کا درجہ رکھتی ہے، اس کو امت میں وہ مقبولیت حاصل ہوئی جس کی دوسری نظیر نہیں ملتی، ہر زمانہ میں یہ کتاب مقبول و متداول رہی، چنانچہ ہر دور اور ہر صدی کے لکھے ہوئے اس کے بیشمار نسخے ہر علاقہ میں پائے جاتے ہیں،

پیش نظر نسخہ صحیح البخاری کا ایک اہم اور نادر نسخہ ہے، جو ابتدائے کتاب سے کتاب المناقب تک ہے، تقطیع متوسط، خط جلی، واضح، صاف، ۴۰۰ ورقوں پر مشتمل ہے، ورق ۱۳۲ تک مجدول، طلائی و شنجرفی، لوح کتاب مطلّی و مینا کار آسمانی، جدول پر کیس کا اس قدر اثر ہوگیا ہے کہ حاشیہ حوض سے جگہ جگہ علیحدہ ہوچکا ہے، اور اس کی مرمت کی گئی ہے، ورق ۱۳۲ سے آخر کتاب تک کا حصہ غیر مجدول اور کسی دوسرے کاتب کے قلم کا لکھا ہوا ہے، اول سے آخر تک محشّی ہے، اور حاشیہ اسی خط میں ہے جو مجدول حصہ کا خط ہے۔

اس نسخہ کی اہمیت یہ ہے کہ اس کے کاتب کشمیر کے مشہور عالم خواجہ معین الدین خاوند بن خاوند محمود ہیں، جو اپنے دور کے مشہور عالم اور مشائخ نقشبندیہ میں بلند مرتبہ کے مالک تھے، صاحب روضۃ الاصفیاء لکھتے ہیں

"از عظمائے مشائخ و کبرائے علمائے کشمیر جنت نظیر است، در زہد و ورع و تقوی و اتباع شرع (سنت) و ترویج نسبت و ترفیع بدعت، ثانی نداشت و در ہمہ علما، و صلحائے وقت تحریر و تقریرش مقبول و مشائخ عظام و علمائے کرام را رجوع تمام بخدمتِ وے بود۔"

مولانا عبد الحئی صاحب لکھنوی "نزہۃ الخواطر" میں تحریر فرماتے ہیں:

"احد المشائخ النقشبندیۃ والفقہاء الحنفیۃ ...... تولی الشیاخۃ بعا(کشمیر) وصار مرجعا الیہ فی المذہب والفتوی وانقاد العلماء لاوامرہ وخضعوا لہ۔"

تاریخ کشمیر اعظمی میں ہے:

"فی الواقع تزیین خانقاہ (پدر خود) و ترویج سلسلہ و تنظیم علم و علما بسیار نمود، باوجود صفائی معنوی لقای صوری بکمال داشتند، حسن الوجہ و احسن الاطلاق بود۔"

خواجہ معین الدین کشمیر میں پیدا ہوئے، وہیں تربیت پائی، اپنے والد سے علوم حاصل کیے، پھر دہلی جاکر شیخ عبد الحق محدث دہلوی کے شاگرد ہوئے، حصول تعلیم کے بعد کشمیر واپس آئے، آپ کے والد عارف کبیر خاوند محمود کبار مشائخ نقشبندیہ میں تھے، بخارا کے رہنے والے تھے، ہندوستان آکر کشمیر میں مقیم ہوئے، لاہور، دہلی، آگرہ ان کی آمد و رفت رہتی تھی، سلاطین دہلی اور امرائے وقت کی نظر میں نہایت معزز اور محترم تھے، ہزاروں آدمی آپ سے بیعت ہوئے، جب خاوند محمود نے بادشاہ شاہجہاں کے ایماء[1] سے کشمیر کی سکونت ترک کر کے لاہور میں قیام اختیار کیا تو اپنے صاحبزادے خواجہ معین الدین کو لاہور سے کشمیر بھیجدیا، تاکہ وہاں کی خانقاہ سنبھالیں اور رشد و ہدایت کی خدمت انجام دیں، خاوند محمود کا انتقال ۱۲ شعبان ۱۰۵۲ھ کو لاہور میں ہوا،

[1] خزینۃ الاصفیاء،

اور وہیں شہر سے جانب شرق شالامار باغ سے متصل آپ کا مزار واقع ہے[1]، خواجہ معین الدین کا انتقال کشمیر میں محرم ۱۰۸۵ھ میں ہوا، ان کا مزار آج تک زیارت گاہ خلائق ہے[2]۔

صحیح البخاری کے اس نسخہ کے شروع میں شیخ الکل مولانا عبد الحق صاحب محدث دہلوی (۹۵۲ھ تا ۱۰۵۲ھ) کا رسالہ "تحقیق الاشارۃ الی تعمیم البشارۃ" شامل ہے، یہ رسالہ بھی مولانا معین الدین بن محمود کے قلم کا لکھا ہوا ہے، جس کی کتابت ۱۰۵۹ھ میں ہوئی ہے، اس کا طلائی جدول بھی ان ہی کی قلم کاری کا نمونہ ہے، قدرے محشی بھی ہے، رسالہ کے آخر میں کاتب نے تاریخ کتابت کے ساتھ اپنا پورا نسب نامہ بھی لکھا ہے، یہی شجرہ انھوں نے اپنی مصنفہ کتاب شرح القرآن میں بھی تحریر کیا ہے، نسب کا طویل حصہ چھوڑ کر تاریخ کتابت کے سلسلہ کا نوٹ یہ ہے:

"قد وقع الفراغ بعون اللہ الکریم وفضلہ العمیم من تسوید ہذہ الرسالۃ الشریفۃ المبارکۃ المیمونۃ فی سلخ ربیع الاول یوم الاثنین فی وقت الضحی فی شہور سنۃ الف وتسع وخمسین بید احقر عباد اللہ واضعف عبید اللہ معین الدین خاوند بن حضرۃ قدوۃ الواصلین و زبدۃ العارفین قطب الارشاد حضرت خواجہ خاوند محمود نور اللہ مرقدہٗ" ...... الخ

یہ رسالہ بھی مجدول طلائی و شنجرفی اور اس کی لوح مطلی و مینا کار آسمانی ہے، رسالہ کے شروع میں ایک نوٹ ہے جس کی ابتدائی عبارت قدرے محو شدہ ہے، باقی کی عبارت یہ ہے:

"کاتب الاسطر نظام الدین محمد شاہ بن شیخ الاسلام مولوی قوام الدین محمد المفتی بن شیخ الاسلام السعید مولوی معز الدین امان اللہ الشہید علیہ الرحمۃ من اللہ المجید بن مولانا خیر الدین ابو الخیر۔ اللّٰہم اختم

[1] خزینۃ الاصفیا، [2] ایضاً

بالخیر وارفع عنا شر الغیر برحمتک یا ارحم الراحمین وصلی اللہ علی خیر خلقہ والہ اجمعین"

اس عبارت کے تحت میں ایک دوسرے خط سے یہ نوٹ دیا ہوا ہے:

قد اخذ جدی خیر القراء عن استاذہ مولانا محمد امین امنہ اللہ یوم الجزاء عن ملا محمد افضل بن خواجہ حیدر عن مولف الرسالۃ الشیخ المطلق الشیخ عبد الحق نور اللہ تربتہ وقد اخذ مولانا خیر الدین عن مولانا محمد طیب بن مولانا محمد حیدر بن فیروز الکشمیری الچرخی"

مولانا معین الدین نے "صحیح البخاری" کے اس نسخہ کی کتابت مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں وقف کرنے کی نیت سے کی تھی، لیکن وہ صرف ابتدائی ۱۳۱ ورق اپنے قلم سے لکھ سکے، اس کا جدول تیار کیا، رسالہ تحقیق الاشارہ لکھا اور اس کا جدول تیار کیا، باقی حصے کی کتابت خود نہیں کر سکے، کسی دوسرے کاتب سے لکھوایا، لیکن اول سے آخر تک حاشیہ اپنے قلم سے لکھا، تحشی میں شروح بخاری اور لغات و رجال کی کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے، کتاب کے آخر میں ان کی مہر ثبت ہے، جو مدور ہے، اور اس میں ذیل کی عبارت کندہ ہے:

"چو نامم در ازل کردی معین الدین بفضل خود معین دین بگردان الہی"۔

مہر چونکہ پوری طرح واضح نہیں ہے، اس لیے ممکن ہے کہ الفاظ میں قدرے تقدیم و تاخیر ہو گئی ہو، مہر میں ۱۰۶۲ھ کندہ ہے، اس مہر کے ساتھ وقف کے سلسلہ میں ذیل کا قطعہ تحریر کیا ہے:

لواقفہ

یارب انی نذرت اذا وصلت الی المدینۃ	نقد صحیح البخاری عند محدث المدینۃ
لتحصل لی اجازۃ من اعلم المدینۃ	وقفتہ رجاء ان یرضی عنی حبیب المدینۃ

اس کے بعد کاتب نے اس نسخہ کی کتابت دوسرے کاتب کے قلم سے اس کی تکمیل، مشمولہ رسالہ کی

کتابت اور تحشی کے سلسلہ میں ایک طویل تحریر لکھی ہے، جس کا کچھ حصہ ضائع ہو گیا ہے،

کاتب مولانا حیدر[1] کشمیری محدث کے شاگرد تھے، اس لیے اس کے بعد وہ سند بھی لکھی جو سماع حدیث کی ان کو حاصل ہوئی، اس سند کا بھی کچھ حصہ اوراق کے چسپاں ہو جانے کی وجہ سے ضائع ہو گیا ہے، اس لیے ما یقرأ ضروری حصہ نقل کیا جاتا ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم، احمد اللہ علی عظمتہ جلالہ واشکرہ بجزیل نوالہ واثناء علیہ ثناء لا ینقطع بل یزید رافعا اکف الضراعۃ والابتہال فی ان یوفقنا لما یحب ویرضی واشہد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ الموصوف بصفات الکمال المنعوت بنعوت الجلال والجمال واشہد ان سیدنا محمدا عبدہ ورسولہ ذو المقام الاعلی الارفع۔۔۔۔ اما بعد فلما شمر عن ساق جدہ فی علوم الحدیث الشریف وسعی فی الارتقاء۔۔۔۔ واغتنم الفرصۃ بتوفیق الملک المنان الشیخ الفاضل الصالح الکامل۔۔۔۔۔۔۔ الاعز الاکرم معین الملۃ والدین بن حضرۃ قدوۃ العارفین زبدۃ آل طٰہٰ و یٰسین خواجہ خاوند محمود العطاری النقشبندی علوی الحسینی شکر اللہ سعیہ وحصل منہ ما یکفیہ لخذ منہ۔۔۔۔۔ طلب الاجازۃ۔۔۔۔۔ وان لم اکن صالحا لذلک ولکنی احببت اقتداء

---

[1] کشمیر کے بڑے محدث مشہور عالم اور حیدر بن فیروز محدث کے نام سے مشہور تھے۔ سات سال کی عمر میں حفظ قرآن کیا، مختصرات شیخ نقیب الدین سے پڑھیں، مولانا جوہر محدث کی صحبت میں تحصیل علوم کی، پھر دہلی جا کر شیخ عبد الحق محدث دہلوی سے تلمذ حاصل کیا، کشمیر واپس ہو کر درس و افادہ میں مشغول ہو گئے، ارباب وقت نے کئی بار خدمت قضا آپ کے سپرد کرنا چاہی مگر آپ نے منظور نہیں کی۔ ۱۰۵۷ھ میں کشمیر میں انتقال ہوا۔ (نزہۃ الخواطر بحوالہ حدائق حنفیہ)

للسلف الصالحین وبقاء لهذه السنة السنية واجزت له ان یروی عنی کتاب مشکوٰۃ المصابیح وجمیع .... روایة عنی مما اجازنی شیخی ...... فرید دهره الشیخ المحدث عبد الحق الدهلوی بن ...... اجازة تامة ...... کتب هذه الاسطر العبد الضعیف الفقیر الی الله القوی حیدر بن فیروز ...... الجرخی عفی عنه فی ..... سنة الف واربع وخمسین"۔

نسخہ کی ابتدا میں وقف کے سلسلہ میں ذیل کی عبارت پختہ خط میں درج ہے :۔

وقفت هذا الکتاب من خالص	یہ کتاب میں نے خالص اللہ تعالیٰ کے لیے،
ملکی لله تعالیٰ طلبا لثوابه وهربا	ثواب کی طلب اور اس کے عتاب سے بچنے کیلئے
من عقابه علی طلبة العلم ینتفعون	طالب علموں پر وقف کی تاکہ وہ تعلیم و تعلم اور
بها تعلیما وتعلما ومطالعة وکتابة	مطالعہ و کتابت میں اس سے فائدہ حاصل
وقفا صحیحا مؤبدا لایوهب ولا	کریں، یہ وقف صحیح و دائمی ہے، اس کا نہ
یورث ولا یباع ولا یرهن ولا	ہبہ ہو سکتا ہے نہ وراثت نہ بیع ہو سکتی ہے
یملك بسبب من الاسباب قائما	نہ رہن، اور کسی سبب سے وہ کسی کی ملک نہیں
علی اصوله ماضیا علی سبیله	ہو سکتا، وہ ہمیشہ وقف کے اصول پر
ابد الآبدین الا ان یرث الارض	قائم و دائم جاری رہے گا۔
ومن علیها وهو خیر الوارثین	

اس عبارت کے ساتھ ایک مدور بیضوی مہر ثبت ہے جس کا زیریں حصہ "ملا قوام الدین" پڑھا جاتا ہے، یہ وہی مولوی قوام الدین محمد معلوم ہوتے ہیں جن کے لڑکے نظام الدین محمد شاہ کا نوٹ اوپر گذر چکا ہے، اس صفحہ پر تین اور مہریں بھی ثبت ہیں جو محو شدہ ہیں، اس لیے پڑھی

نہیں جا سکتیں، غالباً یہ مہریں شاہی تحویلداروں کی ہیں، کیونکہ ہر مہر کے ساتھ "عرض دیدہ شد" لکھا ہوا ہے، اس کے بھی مٹانے کی کوشش کی گئی ہے، ایک عبارت کے ساتھ سنہ بھی درج ہے جو ایک ہزار اور کچھ ہے، دہائی پڑھنے میں نہیں آتی،

ان مہروں اور عبارتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ معین بن محمود اس نسخہ کو مدینہ طیبہ نہیں بھیج سکے اور وہ ہندوستان ہی میں رہا، اور شاہی کتب خانوں میں داخل ہو گیا یا علماء و فضلا کے زیر مطالعہ رہا، یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ معین صحیح البخاری کی دوسری جلد (نصف آخر) بھی نہیں لکھوا سکے، کیونکہ اس سلسلہ کے تمام نوٹ اور ضروری عبارتیں جلد کے اول یا آخر میں درج ہیں، اگر دوسری جلد بھی تیار ہو گئی ہوتی تو اختتام کتاب سے متعلق نوٹ اس دوسری جلد کے آخر میں ہوتے۔

صحیح البخاری جس حصہ سے شروع ہوتی ہے اس کے اوراق اول پر شیوخ بخاری کا سلسلہ کاتب کے قلم سے اس طرح لکھا ہوا ہے:

ذکر الشیوخ التی بلغ من جهتهم الی النبی صلی الله علیه وسلم بثلاثة وسائط۔

البخاری عن:
- عن عاصم بن خالد عن جریر بن عثمان عن عبید الله بن بشر عن النبی صلی الله علیه وسلم
- عن خلاد بن یحیی عن عیسیٰ بن جهان عن انس عن النبی صلی الله علیه وسلم
- عن المکی بن ابراهیم عن یزید بن عبید عن سلمه بن الاکوع عن النبی صلی الله علیه وسلم
- عن ابی عاصم النبیل عن یزید بن ابی عبید عن سلمه بن الاکوع عن النبی صلی الله علیه وسلم
- عن محمد بن عبد الله الانصاری عن حمید عن انس عن النبی صلی الله علیه وسلم

اسی صفحہ پر ایک مدور مہر بھی ثبت ہے جو محو شدہ ہے اس کا کوئی لفظ سمجھ میں نہیں آتا، اسی صفحہ کے بالائی حصہ میں غالباً کاتب کے کسی شاگرد کے قلم سے ذیل کا نوٹ ہے جس میں کاتب کا نسب نامہ نقل کیا گیا ہے۔

صحیح البخاری کا یہ نسخہ مختلف حیثیتوں سے بڑا نادر اور تاریخی ہے، عرصۂ دراز سے آبائی کتب خانہ میں محفوظ ہے، اس وقت بھی والد مرحوم مولانا حکیم محمد عرفان خاں صاحب ناظم شریعت ٹونک کے کتب خانہ میں ہے، یہ کتب خانہ سعیدیہ لائبریری کے بعد ٹونک میں سب سے اہم کتب خانہ ہے، جو متعدد نوادر پر مشتمل ہے اور درسی و غیر درسی قلمی و مطبوعہ کتابوں کا ایک اچھا ذخیرہ ہے، اس کتب خانہ پر ایک مضمون علحدہ زیر ترتیب ہے جو انشاء اللہ ناظرین کے سامنے بعد میں پیش کیا جائے گا،

خواجہ معین بن محمود متعدد تصانیف کے مالک ہیں، مختلف تذکروں میں ان کی مندرجۂ ذیل تصانیف کا ذکر ہے:

(۱) فتاوی نقشبندیہ۔ یہ فتاوے آپ نے علمائے عصر کی خواہش پر ان کے اتفاق سے مرتب کیے،

(۲) کنز السعادت، یہ رسالہ مسائل فقہیہ کے سلسلہ میں تالیف کیا گیا۔

(۳) رسالہ رضوانی (فی السیر و السلوک) اس رسالہ میں اپنے والد خاوند محمود کے حالات، کرامات اور مراتب بیان کیے ہیں، اور اپنا آبائی نسب نامہ بھی دیا ہے،

تاریخ کشمیر اعظمی میں ان تصانیف کے علاوہ یہ بھی لکھا ہے "تالیف دیگر دارند" لیکن ان کی تفصیل نہیں دی ہے، اسی طرح دوسرے تذکروں میں بھی صراحۃً کسی دوسری تصنیف کا نام نہیں مل سکا، سعیدیہ لائبریری ٹونک میں ان کی دو اہم تصانیف محفوظ ہیں، چونکہ ان کتابوں کا ذکر دوسرے تذکروں میں نہیں ہے، اور ان کے خطبہ سے آپ کی کچھ دوسری تصانیف کا بھی پتہ چلتا ہے، اس لیے ذیل میں ان کا اجمالی تعارف کرایا جاتا ہے،

(۱) زبدۃ التفاسیر (عربی)۔ کاغذ خانی مجدول نیلگوں و شنجرفی تقطیع متوسط خوشخط بخط نسخ، صفحات ۱۰۱۷، ابتدائی عبارت اس طرح ہے:

الحمد للہ الذی نزل کتابہ الذی ہو ناسخ الادیان۔ الخ

آخر کی عبارت اس طرح ہے:- "الحمد للہ حمداً کثیراً قد وقع الفراغ من تالیف ہذا التفسیر..... و فی کشف وجوہ عرائس الفرائد مع الاقتصاد عن طرفی الاکثار و الاقلال"۔

کتاب کا خطبہ اورنگ زیب عالمگیر کے نام کا لکھا گیا ہے۔ "شاہ اورنگ زیب عادل عالمگیر" تاریخ تصنیف ہے، اس کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ میں عرصۂ دراز سے ان بدعات و اہواء کی وجہ سے پریشان تھا، جو اس ملک میں رائج ہیں، بیس سال کے بعد عالمگیر کا دور آیا اور مجھے اور اہل ملک کو اطمینان حاصل ہوا تو بطور شکریہ میں نے یہ تفسیر لکھی اور بادشاہ کے حضور میں پیش کی۔ متن قرآن کو "ق" سے اور تفسیر کو "ت" سے ظاہر کیا گیا ہے۔

یہ نسخہ نواب محمد علی خاں والی ریاست ٹونک کے ایک درباری عالم محقق العلماء مولانا عبد الکریم صاحب خوشنویس کے قلم کا لکھا ہوا ہے، کاتب نے تاریخ کتابت لکھتے ہوئے ان الفاظ میں کتاب پر تبصرہ کیا ہے،

"التفسیر الذی لا نظیر لہ فی وجازۃ لفظہ و سلاسۃ مبانیہ و ایضاح معانیہ"

یہ نسخہ نواب محمد علی خاں کے صاحبزادہ محمد اسحق خاں کیلئے لکھا گیا تھا، اور ۲۵ شوال ۱۲۹۴ھ کو اس کی کتابت سے فراغت ہوئی، کتاب کا اصل نسخہ بھی نواب صاحب کے پاس محفوظ تھا لیکن وہاں کی قدیم و جدید فہرستوں میں اب اس کا ذکر نہیں ملتا، یہ حسن اتفاق ہے کہ ایک روز میں اپنے دادا قاضی عبد الحکیم خاں (المتوفی ۱۳۲۵ھ) کی کتابوں کی قدیم فہرست جو موصوف نے اپنے والد قاضی عبد الکریم خاں (المتوفی ۱۳۰۱ھ) کے انتقال کے بعد ترتیب دی تھی دیکھ رہا تھا کہ اس فہرست میں سرورق اس کتاب کا نام "تفسیر زبدۃ التفاسیر قلمی خوشخط مطلی مجلد" نظر آیا، اس کے ساتھ دادا صاحب مرحوم کے قلم سے یہ نوٹ بھی دیا ہوا ہے "منجملہ کتب ہذا کے تفسیر زبدۃ التفاسیر بقیمت مبلغ چالیس روپیہ کلدار نواب صاحب محمد علی خاں صاحب بہادر نے بمقام بنارس خرید فرمائی تھی،

اور میرے والد مرحوم (قاضی عبد الکریم صاحب) کے پسند کرنے پر حضور نے عنایت کی تھی"،

قاضی عبد الکریم صاحب چونکہ مولوی محمد مفتی صاحب کے بیٹے تھے جو نواب وزیر الدولہ اور نواب محمد علی خاں دونوں کے استاد تھے اس لیے دونوں میں بڑے مراسم تھے، قاضی صاحب موصوف نے اسی تعلق کی وجہ سے جب نواب صاحب بنارس میں مقیم تھے، ان سے ملنے کیلئے بنارس کا پیدل سفر کیا تھا، غرض اس طرح زبدۃ التفاسیر کا مذکورہ نسخہ ٹونک منتقل ہوا، مگر افسوس یہاں بھی محفوظ نہ رہ سکا اور اسی وقت کہیں منتقل ہوگیا، راقم اس کتاب کے دوسرے نسخے کی تلاش میں رہا اور محب محترم مولانا عرشی رامپوری کے تحریر فرمانے کے مطابق پٹنہ لائبریری سے رابطہ پیدا کیا گیا، وہاں اس کتاب کا ایک قدیم نسخہ محفوظ ہے، پٹنہ لائبریری کے لائبریرین صاحب کی تحریر کے مطابق یہ نسخہ ۱۱۰۱ھ کا مکتوبہ ہے، کاتب کا نام درج نہیں، صفحات کی تعداد ۷۸۲ ہے، کتب خانہ کی فہرست میں نمبر ۱۴۴۶ اس کا اندراج ہے، بانی کتب خانہ کا خرید کردہ نسخہ ہے، کتاب پر کسی طرح کی کوئی تحریر نہیں جس سے اندازہ کیا جاسکے کہ یہ نسخہ کہاں کہاں رہا اور کس طرح وہاں پہنچا، یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ نسخہ مصنف کے قلم کا لکھا ہوا ہے، یا تصنیف کے بعد مصنف کی زندگی میں کسی دوسرے کاتب سے لکھوایا گیا، کسی موقع پر ان شاء اللہ مصنف کے قلم کے صحیح البخاری کے نسخہ سے مقابلہ کرکے خط کا اندازہ لگایا جاسکے گا۔

(۲) شرح القرآن۔ (فارسی) یہ بھی فارسی تفسیر ہے جو ۱۱۰۲ھ میں تصنیف ہوئی، تمہید میں مصنف علام لکھتے ہیں کہ جب حج بیت اللہ کا عزم مصمم ہوا تو اس خیال سے کہ اس طویل سفر میں تفسیر کی متعدد کتابیں ساتھ رکھنا مشکل ہے، مختلف تفاسیر سے اخذ کرکے تفسیر اول جس کا نام زبدۃ التفاسیر من جہد المعین ہے لکھی، پھر بعض احباب و تلامذہ کا اصرار ہوا کہ اسی طرز پر فارسی میں بھی ایک تفسیر لکھنی چاہیے، اس سے پہلے کہ اس فرمایش کی تکمیل کیجاتی، سفر حج کے لیے مسائل فقہیہ پر مشتمل ایسے ہی مجموعہ کی ضرورت تھی، اس ضرورت سے فتاوی نقشبندیہ ترتیب دیا گیا، اور اس کا نام "فتاوی

النقشبندیہ یہ خزائن الفقہ المعینیہ" رکھا گیا، علم تصوف میں بھی ایسی ہی جامع کتاب کی ضرورت تھی، چنانچہ ایک کتاب ترتیب دیگئی اور ابتداءً اس کا نام "مفرح القلوب" رکھا گیا، پھر بعد میں "المرقۃ للقلوب و ورقۃ العیون" تجویز کیا گیا، ابھی اس کی تکمیل نہیں ہوئی تھی کہ حسب الہام غیبی تفسیر فارسی شرح القرآن کا خطبہ لکھنا شروع کیا گیا، خیال تھا کہ دو سال میں اس کی تکمیل ہوسکے گی لیکن صرف چھ[1] مہینہ میں مکمل ہوگئی، ۸ رجب ۱۱۰۱ھ کو اس کی ابتدا ہوئی اور محرم ۱۱۰۲ھ میں اس سے فراغت ہوگئی،

مصنف نے مقدمہ میں یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ وہ ان کتابوں کی ترتیب سے پہلے کتب احادیث کا ایک انتخاب[1] بھی اسی طرح تیار کرچکے تھے، اس سلسلہ میں انھوں نے فارسی کے چند دوسرے رسائل کا بھی ذکر کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ "مرآۃ العدالۃ" اور "رسالہ رد الملاحدۃ" بھی آپ کے مصنفہ رسائل ہیں،

شرح القرآن فارسی کا پیش نظر نسخہ ٹونک کے کتب خانہ میں محفوظ ہے، اس کا کاغذ سفید خانی دبیز، تقطیع کلاں، قدرے کرم خوردہ، مجدول، خط نسخ پختہ، خوشخط، ۱۲۸۴ صفحات پر مشتمل ہے، شروع کی عبارت یہ ہے:

> اولہ۔ حمد نامحدود و ثنائے نامعدود معبودی را سزد بست کہ حمد جمیع حامدان و ثنائے جمیع ثنا خواں راجع بذات پاک اوست الخ

آخر کی عبارت اس طرح ہے:

> قد وقع الفراغ من تصنیف شرح القرآن بعد ستۃ اشہر یزید علیہا عشرون عند وسط یوم الخمیس من آخر شہر اول من سنۃ ثانیۃ السبعین بعد الف حول حول من ہجرۃ النبی سید الانبیاء افضل المرسلین صلوات اللہ والسلام علیہ وعلی آلہ و اصحابہ اجمعین"

---

[1] ہو سکتا ہو کہ صحیح البخاری کا پیش نظر نسخہ اس سلسلہ کی ایک کڑی ہو اور اسی ضمن میں آپ نے حرم نبوی میں پیش کرنے کی غرض سے [illegible]

نسخہ قدیم ونادر اور مصنف کی حیات کا لکھا ہوا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اس نسخہ کی کتابت کسی دوسرے کاتب سے کرائی ہے، پھر اس کی تصحیح اپنے قلم سے کی ہے، اس لیے کہ تصحیح کا خط اکثر مقامات پر وہی ہے جس خط میں صحیح البخاری کی تصحیح کیگئی ہے، کتاب کی حالت اور فہرست مضامین مشمولہ کتب سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نسخہ مصنف کی حیات کا ہے، رمضان ۱۲۸۹ھ میں جب نواب صاحب بنارس میں مقیم تھے، یہ نسخہ مولوی عبداللہ کی معرفت نواب صاحب کے کتب خانہ کیلئے بائیس روپیہ آٹھ آنہ میں سندیلہ سے خریدا گیا، ان تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ شرح القرآن کا یہ نسخہ، زبدۃ التفاسیر کا مذکورۂ بالا نسخہ اور صحیح البخاری کا اصل نسخہ جس پر یہ مضمون حوالۂ قلم کیا جارہا ہے، نواب محمد علی خانصاحب نے غالباً ایک ساتھ سندیلہ سے خریدے ہوں، جہاں یہ نسخے کسی طرح پہنچے ہوں گے، شرح القرآن کا نسخہ نواب صاحب کے کتب خانہ میں محفوظ رہا، اور زبدۃ التفاسیر و صحیح البخاری کے نسخے ہمارے خاندان میں منتقل ہو گئے،

علامہ معین بن محمود کی تصانیف میں فتاوی نقشبندیہ کے نسخے اکثر کتب خانوں میں محفوظ ہیں، اسی طرح رسالہ رضوانی کے نسخے بھی ملتے ہیں، چنانچہ تذکروں میں اس رسالہ اور اسکے مندرجات کا ذکر موجود ہے، زبدۃ التفاسیر کے نسخے ٹونک اور پٹنہ کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں، شرح القرآن فارسی کے کسی نسخہ کا علم ٹونک کے کتب خانہ کے علاوہ ابتک نہیں ہو سکا ہے، اسی طرح مصنف کے باقی رسائل کا پتہ نہیں چل سکا، اگر کسی صاحب کے پاس ہوں یا کسی صاحب کے علم میں ہوں تو ان کی تفصیلات شائع کرنے کی تکلیف فرمائیں۔

ادبیات

غزل

از جناب تسکین قریشی

ادھر ساقی، اُدھر پیر خرابات — مبارک مے پرستانِ خوش اوقات

غمِ دل کے بہت نازک ہیں حالات — شکایت لب پہ آئی اور گئی بات

سمجھ لیں اہلِ دنیا خوب یہ بات — کہ دنیا ہی نہیں دار مکافات

بہت دلکش سہی ہر عالمِ حسن — مگر ہر بے رخی میں اور ہی بات

کمالِ عشق میں یکساں ہیں دونوں — غمِ فرقت ہو یا عیشِ ملاقات

سراپا شوق، یکسر بے نیازی — یہی جذب و جنوں کی ہیں علامات

چلے ہیں کارواں کے پیچھے پیچھے — ہمارے رہبروں کی بھی ہے کیا بات

زیارت گاہِ اہلِ جستجو ہیں — مری ہر لغزشِ پا کے نشانات

خرد کی جستجو حدِ نظر تک — جنوں ہے صاحبِ کشف و کرامات

مجھے کل صحبتِ واعظ میں تسکیںؔ
بہت یاد آئے میخانے کے دن رات

غزل

از جناب طالب جے پوری

دلِ امیدوار کا عالم
بے بہار اک بہار کا عالم

ہر نفس اشتیاق کی دنیا
ہر نظر انتظار کا عالم

جانفزا ہر نگاہ لطف آگیں
دل فریب اعتبار کا عالم

گفتنی ہو تو کوئی بتلائے
دلِ بے اختیار کا عالم

بجلیاں مہربان ہوں جس پر
ہائے اُس شاخسار کا عالم

دامن تار تار ہے اور ہم
کچھ نہ پوچھو بہار کا عالم

روبرو اُن کے دیدنی ہے آج
ناصحِ غم گسار کا عالم

اے اسیرِ فسونِ چشمِ بتاں
دیکھ لیل و نہار کا عالم

ہم نے دیکھا ہے عمر بھر طالبؔ
گردشِ روزگار کا عالم

غزل

از جناب چندر پرکاش جوہرؔ بجنوری

محبت میں خرد کی این و آں کیا
یہاں ہنگامۂ لفظ و بیاں کیا

خموشی سوز بانوں کی زباں ہو
طریقِ عشق میں آہ و فغاں کیا

رہے گی آنکھ کب تک محوِ حیرت
نہ اٹھے گا حجابِ درمیاں کیا

جہاں میں تھک کے بیٹھوں میری منزل
محبت میں تلاشِ کارواں کیا

چمن ہی سے وجودِ آشیاں ہے
چمن ہی جب نہیں تو آشیاں کیا

گماں بھی ہے یقیں کی ایک منزل
یقیں جس پر نہ آئے وہ گماں کیا

خرد کی منزلِ خوشِ آگہی کا
جنوں سے بڑھ کے کوئی رازداں کیا

محبت جس کو راس آجائے جوہرؔ
اُسے اندیشۂ کون و مکاں کیا

مطبوعات جدیدہ

محدثین عظام اور انکے علمی کارنامے۔ از مولانا تقی الدین ندوی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، ضخامت ۲۵۶ مجلد مع گرد پوش، قیمت [illegible]، پتہ ابو سعد اعظمی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

مولانا تقی الدین ندوی مظاہری استاذِ حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء کے محدثین عظام پر جو مضامین بعض علمی رسالوں میں شائع ہوئے تھے، اب انھوں نے ان کو افادۂ عام کے لیے کتابی صورت میں شائع کیا ہے، اس میں صحاح ستہ کے مصنفین کے علاوہ ائمۂ اربعہ اور امام طحاوی کے حالات، خدماتِ حدیث، دوسرے کارناموں اور ان کی مشہور تصنیفاتِ حدیث پر تبصرہ کیا گیا ہے، شروع میں ایک مبسوط مقدمہ ہے جس میں حدیث کی اہمیت و حجیت اور اس کے ضبط و تحفظ میں اہتمام و احتیاط کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے اور منکرینِ حدیث کے اعتراضات کا شافی جواب دیا گیا ہے، لائق مصنف کو فنِ حدیث سے خاص مناسبت ہے، اور احادیث اور اس کے متعلقات پر ان کی اچھی نظر ہے، اور یہ کتاب انھوں نے بڑی محنت و جستجو سے لکھی ہے، زبان و بیان سلیس اور شگفتہ ہے، شروع میں مولانا ابو الحسن علی ندوی کا ایک مختصر مگر جامع تبصرہ بھی ہے، حدیث کے طلبہ اور اساتذہ کے لیے اس کتاب کا مطالعہ بہت مفید ہے۔

تاویل الاحادیث (عربی): مرتبہ مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ معمولی، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۵۵، قیمت [illegible]، پتہ شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدرآباد (سندھ) پاکستان۔

یہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی مشہور تصنیف ہے، اس میں انھوں نے بڑے دقیق اور الو

انداز میں انبیاے کرام کے ان واقعات اور قصوں کے جو قرآن میں مذکور ہیں، اسرار و رموز بیان کیا ہے، اور یہ دکھایا ہے کہ معجزات مادی اسباب اور قانون فطرت کے خلاف نہیں بلکہ ان کے عین مطابق ہیں، اور منکرین انبیاء کے عذاب کا تعلق طبعی واقعات اور مادی اسباب سے بھی ہوتا ہے، یہ کتاب پہلے چھپ چکی ہے، اور غالباً اس کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے، اب الرحیم کے اڈیٹر غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب نے اس کا عربی متن دو قدیم اور اہم نسخوں کی مدد سے مع حواشی اور مقدمہ کے شائع کیا ہے، مقدمہ میں شاہ صاحب کے علم و کمال اور اس کتاب کی اہمیت اور اس کے مباحث پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور حاشیے میں زیادہ تر اختلاف نسخ ظاہر کیا گیا ہے، اس کتاب سے حضرت شاہ صاحب کی نکتہ آفرینی اور دقیقہ سنجی کا اندازہ ضرور ہوتا ہے، مگر اس کا موضوع بڑا نازک اور پیچیدہ ہے، اس لیے اہل علم اور خواص ہی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، عوام کے لیے اس کا مطالعہ مضر بھی ہو سکتا ہے،

ارمغان آصف : مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۳۰۰، قیمت عہ، پتہ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی، نئی دہلی۔

آصف علی بیرسٹر مرحوم تنہا سیاست ہی کے مرد میدان نہ تھے، بلکہ وہ دلی کی پرانی تہذیب کا بھی نمونہ تھے، خارزار سیاست کی الجھنوں کے ساتھ شعر و ادب کا بھی نہایت بلند مذاق رکھتے تھے، خود بھی شاعر و ادیب تھے اور چکی کی مشقت کے ساتھ مشق سخن بھی جاری رہتی تھی، چنانچہ ان کے مضامین اور شاعری کا بڑا حصہ زندان کی یادگار ہے، خواجہ احمد فاروقی صاحب نے ان کو مرتب کرکے ارمغان آصف کے نام سے شائع کیا ہے، اس مجموعہ کے ادبی و تنقیدی مضامین میں خطوط خواجہ حسن نظامی، کلام بیدل پر ایک نظر، اور پیام اقبال اور سیاسی مضامین میں ہوم رول یا حکومت خانگی خاصے کی چیز ہیں، سوانحی خاکوں میں میرن صاحب، اور تمثیلی مضامین میں سرگذشت انقلاب ادب و انشاء کی سلاست و لطافت اور دہلی کی زبان کی حلاوت و شیرینی کا نمونہ ہیں، نظم میں

انھوں نے غزلیات، رباعیات و قطعات، مثنویات اور نظموں وغیرہ مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی اور سب میں اپنی قادر الکلامی کا ثبوت دیا ہے، فارسی میں بھی ان کو پوری دستگاہ حاصل تھی، ان کی نظم و نثر کے نمونے بھی اس مجموعہ میں موجود ہیں، اس لیے ارمغان آصف اصحاب ذوق کے لیے ارمغان ادب بھی ہے، لائق مرتب نے اس کو شائع کرکے مفید ادبی خدمت انجام دی ہے،

دیوان بقا اکبرآبادی ۔ مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت نہایت عمدہ، صفحات ۱۰۰، مجلد، قیمت سے، پتہ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی ۶۔

میر و سودا کے زمانہ کے ایک گمنام شاعر بقا، اللہ بقا صاحب دیوان تھے، جن کا چراغ ان دونوں باکمالوں کے سامنے نہ جل سکا، خواجہ احمد فاروقی صاحب نے ان کا دیوان جو اب تک غیر مطبوعہ تھا مرتب کرکے شائع کیا ہے، اس کی اصل اشپرنگر کے ذخیرہ سے حاصل کی گئی ہے، یہ دیوان غزلیات، رباعیات و قطعات، قصائد، ہجویات وغیرہ مختلف اصناف سخن پر مشتمل ہے، کچھ فارسی کا کلام بھی ہے، شروع میں لائق مرتب کے قلم سے بقا کے کلام پر تبصرہ ہے، یہ دیوان رطب یابس کا مجموعہ ہے، ہجویں خاص طور سے رکیک اور مبتذل ہیں لیکن کچھ اچھے اور بلند پایہ اشعار بھی مل جاتے ہیں، اور ایک قدیم شاعر کی حیثیت سے ان کا کلام قابل قدر ہے، اور اس کو شائع کرکے خواجہ صاحب نے بقا کو فنا سے بچا لیا، اور ان کے بقول اس کا مطالعہ میر و سودا کے عہد کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے،

(ض)

صہبائے سخن ۔ از جناب ڈاکٹر محمد عبد الحی صاحب عارفی، متوسط تقطیع، کاغذ قدرے بہتر، کتابت و طباعت بہترین، صفحات ۱۲۰ مجلد، قیمت تحریر نہیں، پتہ ایجوکیشنل پریس، ادب منزل، پاکستان چوک، کراچی،

ڈاکٹر عبد الحی صاحب حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے باختصاص مسترشدین میں ہیں، ان میں شاعری کا

ذوق فطری ہے، چنانچہ وہ طالبعلمی ہی کے زمانہ سے مشق سخن کرتے تھے، مگر ابتدا سے ان کا ذوق بلند اور ستھرا تھا، اس لیے اس دور کی شاعری بھی رسمی غزل سرائی کے ابتذال سے پاک اور پاکیزہ تغزل کا نمونہ ہے، عارف تھانوی سے ارادت کے بعد یہ شراب دو آتشہ ہو کر شراب طہور بنگئی اور بادۂ عرفان کی مستی اور وادی ایمن کی شرر باریاں نظر آنے لگیں، صہبائے عارفی اسی میخانۂ عرفان کی صہبا ہے، اس دور کا کلام محض شاعری نہیں بلکہ ایک صاحبِ دل کی آواز ہے، اس لیے خیالات کی لطافت و پاکیزگی، واردات قلبی، سوز و مستی گوناگوں باطنی کوائف سے معمور، اور اس کا ہر شعر بادۂ معرفت کا چھلکتا ہوا جام ہے، زبان نہایت شستہ و رفتہ، انداز بیان شگفتہ اور اشعار ڈھلے ہوئے سکے معلوم ہوتے ہیں، حسن ظاہری بھی نفاست و لطافت کا مرقع ہے، یعنی جیسی مصفا و پاکیزہ صہبا ہے ویسا ہی شفاف شیشہ و ساغر ہے، اور اس لائق ہے کہ اصحاب ذوق اس سے لطف اندوز ہوں۔

(م)

فارم IV

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس اعظم گڈھ

مقام اشاعت	... ... دار المصنفین اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت	... ... ماہانہ
نام پرنٹر	... ... صدیق احمد
قومیت	... ... ہندوستانی
پتہ	... ... دار المصنفین اعظم گڈھ
نام پبلشر	... ...
قومیت	... ...
پتہ	... ... دار المصنفین اعظم گڈھ
نام اڈیٹر	... ... شاہ معین الدین احمد ندوی
قومیت	... ... ہندوستانی
پتہ	... ... دار المصنفین اعظم گڈھ
نام و پتہ مالک رسالہ	... ...

میں صدیق احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دیگئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔ صدیق احمد

جلد ۹۹ ماہ ذی الحجہ ۱۳۸۶ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۶۷ء عدد ۴

مضامین